

نور جہاں سُر و رجاب



ذکر اُس پرہی وش کا اور بچپن پیان اپنا

لور جہاں سو رجھاں

سعادت حسن منٹو

مکتبہ شعرواءُب سمن آباد لاہور

چودھری اکیڈمی، الفضل مارکیٹ، اردو بازار، ملا ہو



ڈیکھ لٹھڑا

میرے اس سے قبل ایک بھروسہ گنجے فرستے کے عنوان سے لکھ رکھا ہے:
جو شائع ہو چکا ہے۔ میں نے اس میں ان ایکٹریں، ایکٹرسوں، شاعروں اور ادیبوں
کے متعلق اپنے تاثرات پیش کیے تھے جن کو یہ ذاتی طور پر مباحثہ ہوں۔

اب پر اسی تمہارا کام اور سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس کی ابتداء مشہور مخفیہ
اور ایکٹریں نور جہاں سے ہوتی ہے۔ جس سے یہری ملاقات بیٹھی میں ہوتی ہی۔ مگر
اس کا تذکرہ یہاں فشرہ ایں ہے کہ آپ ہرے جملہ تاثرات اس منہموں میں پڑھ
لیں گے جو مکتبہ ڈائیئریکٹر کتابیکے کی صورت میں شائع کردیا ہے۔

یہ سلسلہ کچھ دنیا ہو گا کہ ہر وہ مضمون ہو جو میں ایکٹروں، ایکٹریں اور دیگر
شخصیتوں کے بارے میں لکھوں گا، کتابیکے کی صورت میں ہو گا۔ تاکہ فارمین
کو زیادہ اتنے لارے ای زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ لیکن جب یہ سلسلہ مضمون میں ختم
ہو جائے گا۔ تو مکتبہ ڈائیئریکٹر اسے دوبارہ کتابت کر کے پوسٹ میں جمع
کی صورت میں شائع کرے گا۔ جسے آپ اپنی لا سبریری کی زینت بنا سکیں گے۔

اس سلسلہ کا دوسرہ مضمون غالباً مشہور تر قاصہ ستارہ سے متعلق
ہو گا کہ فلمی دنیا میں اس کی شخصیت مجھے بہت دلچسپ نظر آئی۔ وہ ایک
سمندر ہے جس کو مجھے ایک چھوٹے سے کوڑے میں بند کرنا پڑے گا۔
اس کے بعد کلمہ یہ پکور کا نمبر ہو گا۔ اٹھائی کرنے مشہور سکھ خاندان
کی بیٹی، جسے حال ہی میں بھارت والوں نے پاکستان کا جاسوس قرار دیا
ہے۔ اس کے بعد جو کچھ آئے گا وہ آپ کو میرے اس سلسلہ کے دوسرے
کتابیکے کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا۔

سعادت حسن مندو

۲۵۔ جولائی ۱۹۵۲ء

میں نے شاید پہلی مرتبہ نور جہاں کو فلم "خاندان" میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ بے بی تھی۔ حالانکہ پردوے پر وہ ہرگز ہرگز اس قسم کی چیز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے جسم میں وہ تمام خلطوط، وہ تمام قویں موجود تھیں جو ایک جوان لڑکی کے جسم میں ہو سکتی ہیں۔ اور جن کی وہ بوقتِ خروج نہ مل سکتی ہے۔

"نور جہاں" ان دونوں فلمیں میں لوگوں کے لیے ایک فتنہ تھی، قیامت تھی۔ لیکن مجھے اس کی شکل و صورت میں سبی کوئی چیز نظر نہ آئی، ایک فقط اس کی آواز قیامت خیز تھی۔ سہی گل کے بعد، میں نور جہاں کے گلے سے متأثر ہوا۔ اتنی صاف و شفاف آواز، مُر کیاں اتنی وسیع کھڑج اتنا ہموار، پنچھم اتنا نوکیلا!۔ میں نے سوچا، اگر یہ لڑکی چاہیے تو گھنٹوں ایک سر پر کھڑی رہ سکتی ہے، اسی طرح جس طرح بازہ می گر تھے ہوئے رستہ پر بغیر کسی لغوش کے کھڑے رہتے ہیں۔ نور جہاں کی آواز میں اب وہ لوح، وہ رس، وہ بچپنا اور وہ معصومیت نہیں رہی، جو اس کے گلے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ لیکن پھر بھی نور جہاں، نور جہاں ہے۔ گوئیا منگل پیش کرنی آوانہ کا جادو آج بھل ہر جگہ چل رہا ہے۔ اگر کوئی نور جہاں کی آواز فضائیں بلند

ہو۔ تو کان اس سے بے اعتماد نہیں برت سکتے۔
نور جہاں کے متعلق بہت کم آدمی جانتے ہیں کہ وہ راگ دویا اتنا
ہی جانتی ہے جتنا کہ کوئی استاد۔ وہ ہمدری گاتی ہے، خیال گاتی ہے۔
دھرپہ گاتی ہے۔ اور ایسا گاتی ہے کہ گانے کا حق ادا کرتی ہے۔
موسیقی کی تعلیم تو اس نے یقیناً حاصل کی تھی کہ وہ ایسے گھرانے
میں پیدا ہوئی، جہاں کا ماحول ہی ایسا تھا۔ لیکن ایک چیز خداداد
بھی ہوتی ہے۔ موسیقی کے علم سے کسی کا سینہ معمور ہو، مگر گلے
میں کس نہ ہو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خالی خودی علم سنبھالنے والوں
پر کیا اثر کر سکے گا۔

نور جہاں کے پاس علم بھی تھا اور وہ خداداد چیز بھی کہ جسے
گلا کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزوں مل جائیں تو قیامت کا بہ پا ہونا
لازم ہے۔

یہی سیہاں آپ کے لیے ایک دلچسپ بات بتاؤں کہ وہ لوگ
جن پر خدا کی مہربانی ہوتی ہے، وہ اس سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے
ہیں۔ میرا مطلب ابھی آپ پر واضح ہو جائے گا۔

چاہیئے تو یہ کہ جو چیز خدا نے عطا کی ہو، اس کی حفاظت کی
جائے۔ تاکہ وہ سخ نہ ہو۔ لیکن میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ
ان کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ غیر شعوری یا شعوری ملود پر پورہ
کوشش کرتے ہیں کہ وہ تباہ و بہ باد ہو جائے۔

ثراہ گلے کے لیے سخت غیر مفید ہے۔ لیکن سہنگ مر جو م

۷

ساری عمر بلا نوشی کرتے رہے۔ کھٹکی اور تیز کی چیزیں گلے کے لیے تباہ کن ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا؟ مگر نور جہاں پاؤ پاؤ بھر تیل کا اجاء کھا جاتی ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ، جب اُسے نسل کے لیے گانا ہوتا ہے تو وہ خاص انتہام سے پاؤ بھرا چاہ کھائے گی۔ اس کے بعد برف کا پانی پڑے گی۔ چھپ مائیکرو فرون کے پاس جائے گی۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ "اس طرف آواز نکھر جاتی ہے۔" یوں آواز کیونکر نکھرتی ہے، گلا کیسے صاف ہوتا ہے، اس کے متعلق نور جہاں ہی بہتر جانتی ہے۔ یوں میں نے اشوف کمار کو بھی برف استعمال کرتے دیکھا ہے کہ جب اُسے گانے کی صدابند می کرنا ہوتی ہے تو وہ سارا وقت برف کے ڈکٹر سے چباتا رہتا ہے۔

جب تک رلکار ڈونڈہ ہیں، سہ گل مر جنم کی آواز کبھی نہیں مرسکتی۔ اسی طرح نور جہاں کی آواز بھی ایک عمر حصے تک زندہ رہے گی۔ اور آنے والی نسلوں کے کافی میں اپنا شہد پیکانی رہے گی۔

نور جہاں کو میں نے صرف پرڈے پر دیکھا تھا۔ میں اس کی شکل و صورت اور ادا کاری کا نہیں، اس کی آواز کا شیدائی تھا۔ وہ کم غریبی۔ اس لیے مجھے چیرت تھی کہ وہ کیونکر اتنے دلفریب طریقے سے گا سکتی ہے۔ اُن دونوں دو آدمیوں کا دور دوڑ رہا۔ مر جنم سہ گل کا اور نور جہاں کا۔

ایوں تو اُن دونوں نخورشید جھپٹائی ہوئی تھی، شستاد کے
بھی چرچے۔ مجھے مگر نور جہاں کی آوازہ ہی سب کی آوازہ دب گئی۔
ثریا بعد کل پیداوار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مہرگل اور
ثریا تو اکٹھے فلم میں پیش ہوئے لیکن نور جہاں اور وہ دونوں
اگاہ اگاہ رہے۔ معلوم نہیں پروڈیویسر کے دماغ میں ان
دونوں کو سمجھا کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا۔ یا کسی اور وجہ سے پروڈیویسر
ان کو ایک فلم میں کاست نہ کر سکے۔ بہر حال مجھے اس کا افسوس ہے
اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر وہ دونوں آئنے سامنے ہوتے تو موسیقی کی
دنیا میں نہایت نجاش گوار القلب برد پا پیدا ہوتا۔

نور جہاں سے میری پہلی ملاقات کیسے ہوئی، کب ہوئی اور
کہاں ہوئی؟! یہ ایک لمبی داستان ہے۔ میں کہی برس تک
بمبی کی فلمی دنیا میں گزار کر چند وجہ کی بنا پر دل برداشتہ ہو کر
دہلی چلا گیا۔ دہلی پر میں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔
مگر بھیاں سے بھی دل اچاٹ ہو گیا۔ بمبی سے مصادر کے ایڈٹر
نے بڑے لدھیانوی کے متعدد خطوط آئئے کہ تم والپس چلے آؤ۔!
”خاندان“ کے ڈائرکٹر شوکت حسین رضوی بھیاں آئئے ہوئے ہیں
اور میرے ہی پاس رکھ رہے ہیں۔ ان کی بہ خرامش ہے کہ تم اُن
کے لیے ایک کہانی لکھو۔

میرے درہلی جھپٹوڑ کر چلا گیا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ
جب کریم شن فیل ہو چکا تھا۔ میں غائبًا کے اگست نہ کو

بھبھی پہنچا۔ شوکت سے میری پہلی ملاقات، اڈلفی چمیز کلبیٹر
روڈ پر ہوئی۔ جو دفتر بھی تھا اور رہائشی مکان بھی۔
بڑا بانکا چھیلا نوجوان تھا۔ گورا رنگ، گالوں پر سرخی، مہین
چہین جوں لگبڑ اسٹائل کی مونچپیں، گھنٹے کھڑے بال۔ لمبا قد
بہت خوش پوشرش، بے داش پتلوان، ہٹکنوں سے بے نیاز کوٹ
ٹنائی کی گردہ نہایت عمدہ۔ چاپ میں لٹک۔ ہم پہلی ملاقات میں ہی خوب
گھول مل گئے۔

میں نے اس کو بہت مخلص انسان پایا۔ میں دہائی سے اپنے
ساتھ اپنے پسندیدہ سگریٹ لیعنی کریون اے کافی سٹاک لے کر آیا
تھا۔ جنگ چپڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بھبھی میں یہ سگریٹ قریب قریب
نایاب تھے۔ شوکت نے میرے پاس میں چھپیں ڈبے اور پچاپ کے
قریب ڈبیاں دیکھیں تو بہت خوش ہوا۔

ہم دونوں کا قیام وہیں ہے۔ اڈلفی چمیز میں تھا۔ دو مرے تھے۔
جہاڑی سارے کے۔ ایک میں دفتر تھا، دوسرے میں رہائشی معاملہ!
مگر دات کو ہم دفتر میں سوتے تھے۔ مرزا مشرف، وغیرہ آجاتے تھے
وہ ہماری چارپائیں بچا دیتے تھے۔

جب تک شوکت وہاں رہا، بڑے ہنگامے رہے، کریون اے
کے سگریٹ اور ناسک کی ہرن مارکر و سکی جو بڑی و اہمیات تھی۔
لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ شوکت "خاندان" کے
بعد گو بہت بڑا ڈائرکٹر بن گیا تھا۔ مگر لاہور سے بھبھی پہنچنے اور وہاں

کچھ دیر رہنے کے دوران میں وہ سب کچھ خرچ ہو چکا تھا۔ جو اُس نے لامہور میں فلم کی ہنگامی اور اخراجات سے پُر زندگی گزارنے کے بعد پس انداز کیا تھا۔ اور میرے پاس تو صرف چند سو روپتھے جو کہ ہر مارکہ و سکی میں غرق ہو گئے۔

بھر حال کسی نہ کسی جیسے گزر ہوتا رہا۔ وہ وقت بہت نازک تھا۔ میں سات آگست کو وہاں پہنچا اور ۷ آگست کی صبح کو جب میں نے کہیں ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی تو لائن "ڈیڈ" یعنی صردہ تھی۔ بعد میں پہ چلا کہ کانگرے یا لیڈروں کی گرفتاریاں چونکہ عمل میں آرہی تھیں۔ اس لیے احتیاطاً ٹیلی فون کا سارا سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ گاندھی جی، جو اپر لعل نہ رہا اور ابوالثکارِ ازاد وغیرہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ اور کسی نامعلوم حکم متعلق کر دیئے گئے۔ شہر کی فضنا باکمل الیکٹرونی جیسے بھرپور بندوق تھے۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ کئی دن تک ہم ہر مارکہ شداب پی کر اپنا وقت کاٹتے رہے۔ اس دوران فلم انڈسٹری میں بعضی القلاں برپا ہو چکا تھا۔ حالات چونکہ غیر لیکٹرنی تھے اس لیے کسی نئے فلم کی تیاری کی کوئی کرتا۔ چنانچہ جن لوگوں سے شرکت کی بات چیت ہو رہی تھی، ایک غیر معینہ عرصے کے لیے کھٹائی میں پڑ گئی، اور ہم نہیں لدھیانوی کے ہاں پکے ہوئے بہ صڑھ کھانے کھا کر لمبی تان کر سوتے رہے۔ لیکن پھر بھی کہبی کہ بار زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے۔ اور ہم کہا نہیں کہ متعلق سوچنا شروع کر دیتے تھے۔

اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ نورِ جہاں نقشی بمیٹی میں ہے۔
لیکن ٹھہریے! میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا۔ میرا
حافظہ جواب دے گیا تھا۔ اصل میں مجھے یہ آنڈاً است ہی کو
معلوم ہو گیا تھا جبکہ میری ملاقات، ابھی شوکت سے نہیں ہوتی تھی۔
مجھے ماہم جبا کر اپنے چند رشتہ داروں سے ملتا تھا۔ اس کے
علاوہ مجھے ایک ریڈ یو آر ٹیٹھ نئی کاپڑہ لینا تھا۔ (ل بعد میں کرشن چندر
سے جس کے مراسم ہے) اس لڑکی کو میں نے آل انڈیا ریڈ یو
وہلی سے بمیٹی بھیجا تھا۔ کیونکہ اس کو فلم میں کام کرنے کا مشوق
تھا۔ میں نے اسے پرنسپری راج اور برج موہن کے نام تعارفی خط
لکھ کر دے دیتے تھے۔ اور اب میں یہ معاوضہ کرنا چاہتا تھا کہ
آیا وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکی ہے یا نہیں!۔ لڑکی ذہین
تھی، کردار اس کا بہت اجھا تھا۔ مکالمے بہت روانی کے ساتھ
ادا کرتی تھی۔ شکل و صورت کی بھی خاصی تھی۔ اس پر مجھے لقین
تھا کہ وہ کامیاب ہو گئی۔

مجھے پتہ چلا کہ وہ شیواجی پارک میں کہیں رہتی ہے۔ مگر
یہ اتنی بڑی جگہ ہے کہ نئی خاتون کا پتہ لگانا بہت مشکل تھا۔
چنانچہ میں نظامی صاحب کے ہاں روانہ ہو گیا جو قریب ہی کیڈل
روٹر پر رہتے تھے۔ مجھے ان کا ایڈر لیں معلوم تھا۔ کہ وہ اکثر
مجھے خط لکھتے رہتے تھے۔ یہ وہی نظامی ہیں جنہوں نے
ممتاز شانستی کو تحریک دی۔ جن کے پاس ولی صاحب برسوں

پڑے رہے اور آخر میں ممتاز شانستی کو نظامی صاحب کے تباہ
ہوئے اصولوں کے تخت ہی لے آئے۔ یہ وہی نظامی صاحب
ہیں جن کی بیوی گلیتا نظامی کے نام سے فلمی دنیا میں مشہور
ہوتی۔ اور جس نے نظامی صاحب کو لات مار کر پے در پے کٹی
شادیاں کیں۔ عدد التوں میں جس کے کئی مقدمے چلے اور جو
اب ایک نئی خواصیورت لڑکی کے ساتھ ڈانس پارٹی بنائے شہر
شہر پاکستان کا پرچار کر رہے ہیں۔

نظامی صاحب سے میری ملاقاتاں صرف خطوط تک ہی
محدود نہیں اور وہ بھی بڑے رسمی تھے۔ میں نے ان کو پہلی مرتبہ
ان کے فلیٹ پر دیکھا۔ میں اگر اس ملاقات کو بیان کروں تو
میرا خیال ہے، دس پندرہ صفحے اس کی نذر ہو جائیں گے۔ اس
لیے میں اختصار سے کام لوں گا۔

نظامی صاحب جو کہ دھوٹی اور بیان پہنے تھے۔ مجھے بڑے
تباک سے ملے۔ انہوں نے میرے آنے کا مقصد پوچھا، جو میں نے
عرض کر دیا۔ آپ نے کہا۔ ”ثنیہ خاتون ابھی آپ کے قدموں میں حاضر
ہو جائے گی۔“

ان کا ایک مریل قسم کا ہندو مینجر تھا۔ اس کو آپ نے حکم دیا
کہ مینٹو صاحب کے لیے فوراً اٹھنیہ خاتون کو حاضر کرو۔ یہ حکم دینے کے
بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ اور کہا کہ وہ میرے لیے قہرہ کی
خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ چنانچہ انہوں نے فوراً انہ باقی طور پر میرے

لیے ایک عمردہ فلیٹ، بہترین فرشچرا اور ایک عدد کار کا بندوبست کر دیا۔

ظاہر ہے کہ میں بہت خوش ہوا۔ چنانچہ میں نے مناسب اور مزہ دل الفاظ میں ان کاش کریے ادا کیا۔ جس کی ان کو بالکل ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ میرے افسانوں کے گردیدہ تھے۔ قارئین سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نظامی صاحب زبانی جمع خروج کے بادشاہ ہیں۔

نظامی سمجھے بھی ہو، لوگ اسے بھڑا کہیں، کنجکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ مجھے اس کا حار و دار لعہ معلوم نہیں۔ لیکن ہیرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک ہمجموں انسان ہے۔ وہ اپنے فن میں پوری بوری مہارت رکھتا ہے۔ میں نے اس روز، یعنی پہلی ملاقات کے دن ہی دیکھا ممتاز شانتی پر اس کا اتناء عب داب تھا کہ کسی باب کا بھی نہیں ہو سکتا۔ اور ولی صاحب اُس کے سامنے یوں جھکتے تھے کہ جیسے کوئی سائیں!

وہ اس گھر کا بادشاہ تھا جس کو سب خراج ادا کرتے تھے۔ اس کا عام صرف پرودیوسر و کوکھانے اور شراب کی دعویٰ میں دنیا، اور بلیک مارکیٹ سے پڑول خریدنا تھا۔ اور ممتاز شانتی کو کامیاب ہونے کے گرو بنانا تھا۔ کہ دیکھو! اگر نہ۔ یوں مکراوگ تو فیکل پرودیوسر سے تھیں کنٹریکٹ یعنی کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ اگر نہ فلا۔ اس سیٹ سے لوں ہاتھ ملاوگ تواں کا مطلب ہے کہ

وہ نہزار روپے اسی رات ہماری جیب میں ہوں گے۔
 پیر صحر وہاں بیٹھا تھا اور جیران ہو رہا تھا کہ میں کس دنیا میں
 آتکا ہوں۔ وہاں ہر چیز مصنوعی تھی۔ ولی صاحب، نظامی صاحب
 کے حکم پر اُن کا پیسہ اٹھا کے لائے اور جھجک کران کے قدموں
 میں رکھ دیا۔ اس میں نہادٹ تھی۔ خدا کی قسم! یکسر نہادٹ تھی۔
 اور ممتاز شانتی دوسرے کرے میں معمولی لباس میں۔ نہایت
 معمولی لباس میں، کھڑکی کے پردوں کے بیچ کیلئے ٹھونک رہی
 تھی، اور نظامی کہہ رہا تھا۔ "منٹو صاحب! یہ بچی نہایت سادہ
 ہے۔ فلمیں لاثن میں رہ کر بھی اسے آس پاس کی دنیا کا کچھ علم نہیں۔
 مردوں کی طرف تو یہ نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اور یہ سب بہری تربیت
 کا نتیجہ ہے۔"

میرا دل کرتا تھا کہ یہ سب فراڈ ہے، یہ سب جعل ہے، لیکن
 مجھے نظامی سا سب کی اُن کے منہ کے سامنے تعریف کرنا پڑتا۔
 لیکن بات نور جہاں کی ہو رہی تھی۔

ممتاز شانتی کو سیدھے راستے پر لگانے اور اس کو صالح تربیت
 دینے کے مختلف باتیں ہو رہی تھیں۔ تو نظامی صاحب نے نور جہاں
 کا ذکر کیا اور مجھے بتایا کہ ان دونوں وہ بھی ان کے زیر سایہ ہے۔ اور ممتاز کی
 طرح تربیت حاصل کر رہی ہے۔ آپ نے کہا:

"منٹو صاحب! اگر یہ لڑکی زیادہ دیر لایا ہو میں رہتی تو اس کا بیڑہ
 غزن ہو جاتا۔ میں نے اسے بیان اپنے پاس بلایا ہے اور سمجھایا ہے

کہ دیکھو بیٹا! صرف فلم سماں بننے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کوئی سماں
بھی ہونا چاہیے۔ اول تو شروع میں عشق اڑانا نے کی کوئی ضرورت نہیں
ادھر ادھر دونوں طرف سے خوب کہا۔ جب بینک میں تھارا کافی روپے جمع
ہو جائے تو کسی ایسے شریف آدمی سے شادی کرو جو ساری عمر تھارا غلام
بن کر رہے۔ آپ کا کیا حنایا ہے منٹو صاحب! آپ تو بڑے دانا ہیں۔
میری ساری دانائی تو نظامی صاحب کے فلیٹ میں داخل ہوئے
ہی پیچے فہرے پانچ پر دھاگ گئی تھی۔ میں کیا جواب دیتا؟ لبس کہہ دیا کہ
آپ بجو کر رہے ہیں وہ مملوکت کے خلاف کیونکہ ہو سکتا ہے۔ وہ
بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے آواز دے کر نور جہاں کو ملا یا
مگر اسی وقت ٹیکلی فون کی گھنٹی بجی اور جنید لمحات کے بعد نور جہاں کی
آواز کسی کرے سے آئی۔ «اکھی آقی ہوں، کمال صاحب کا
فون آیا ہے۔»

نظامی صاحب زیرِ بُب مسکرائے۔ یہ کمال صاحب، جید بامروہی
تفہمے۔ «پکار کے شہرت یافتہ، نظامی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔
”میں عرض کر رہا تھا کہ سماں ہونا چاہیے تو نور جہاں کے لیے
کمال امر وہی سے بہتر سماں اور کوئی ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اس
نے صاف صاف کہہ چکا ہوں کہ شادی وادی کا معاملہ علطہ ہے
بس اپنا اتوں پیدھا کئئے جاؤ۔ کمال کہا سکتا ہے۔ اس کی آدمی کمائی
اگر نور جہاں کو مل جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ اسل میں منٹو صاحب
ان ایکسرسوں کو رد ہیں کمانے کے گز آنے پا رہیں۔»

میں نے مسکرا کر کہا۔ «آپ گرو جو موجود ہیں۔»
نظمی خواہ ہو گیا اور اس نے مجھے فوراً ایک فست کلاس
لیمن سکواش پلایا۔

بس یہاں — نظمی صاحب کے فلیٹ میں جہاں نور جہاں
کی سائیٹفیک طریقے پر ترجیت ہو رہی تھی۔ اس کو وہ نماذم چاٹر خاص
نظمی صاحب کی نگرانی میں سکھائے ہے جا رہے تھے۔ میری نور جہاں سے
سرسری سی ملاقاتیں ہوتی، اور میرا فر عمل یہ تھا کہ یہ لڑکی اپنی بھانی کی
منزیں بڑی قدر سے طے کردہ ہی ہے اور جس کے ہنوٹوں پر
مسکراہٹ اور سہی تجارتی رنگ اختیار کردہ ہی ہے، اور جو موٹاپے
کی طرف مائل ہے، اپنے استاد کی بہترین شاگرد ثابت ہو گی۔
لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

نظمی کی خواہش دراصل یہ تھی کہ جس طرح ممتاز شانتی اس
کے قبضے میں ہے اور اس کا رعب داب لتیہ کرتی ہے۔ اسی
طرح وہ ایک بوڑھی ناںکہ کی طرح نور جہاں کو بھی اپنی نوجی بنالے۔
— ممتاز شانتی کی ساری آمدن نظمی کی تحویل میں رہتی تھی۔ ظاہر
ہے کہ ممتاز شانتی کے مقابلے میں نور جہاں کی قدر قیمت بہت
زیادہ تھی اور نظمی کا ہوشیار دماغ اچھی طرح جانتا تھا کہ نور جہاں کا
متقابل خیرہ کن ہے۔ چنانچہ وہ اس کو اپنے جاں میں پھنسنے کی
نیاز بیاں مکمل کر رہا تھا کہ ...

مشکوک نہیں رخدو می بلیتی پہنچ گیا۔ وہ شوکت، وہ رخصوی

جس سے نور جہاں کا عشق پنچواں ہستہ یونر میں لڑپکا تھا۔ مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی اور بچنے کی خاطر نور جہاں نے عدالت میں بہ بیان دیا تھا کہ شوکت صاحب سے اس کا کوئی ناجائز تعلق نہیں، وہ تو انہیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔

نور جہاں کا یہ عدالتی بھائی اب بمبئی میں موجود تھا۔ کسیع و علیین بمبئی میں، جو فلمی دنیا کی ہاں وہ قائمی۔

میں نے شوکت سے بات کی کہ میں نور جہاں سے ملا ہوں۔ اس وقت مجھے ان کے رومان کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ دونوں کے تعلقات کثیر ہیں۔ میں نے صرف برسیلِ تذکرہ اس کو بتایا تھا کہ نور جہاں سے میری ملاقات نظامی صاحب کے گھر ہوئی ہے۔ ہر مارکہ شراب کا گلائر زور سے شپائی پر رکھ کر اس نے بڑی تند بھی سے کہا۔ «لعنۃ بھیجو، اس پرہ» میں نے اورہ مدقق کہا۔ «میں ہرار بارہ اس کے لیے تیار ہوں، مگر بھی! وہ تمہارے خاندان کی ہیوٹن رہ چکی ہے۔»

شوکت نہیں ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ میں لفظ "خاندان" پر کھیلا ہوں اور اس سے ذمہ اس تھاں کیا ہے بس کر دیا۔ منتظر بہت شرکت ہوئے لیکن بات یہ ہے کہ میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں سننا چاہتا۔ مجھے معاویہ ہے کہ وہ بمبئی میں ہے۔ سالی! میرے پیچھے آئی۔ ہے۔ لیکن مجھے اب اس سے کوئی سوکار نہیں۔

میں نے جب اس کو بتایا کہ وہ کمال امر و سی کو ٹیکی فروں کر رہا تھا۔

اور بیکہ نظاہمی ان دونوں کو قریب لانا پاہتا ہے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بظاہر بے اعتنائی اور بے پرواری ظاہر کردہ ہے۔ مگر انہوںی ملود پر سخت بے چین ہو گیا ہے۔ اس لیے نور اسی ہر انوار کے وہی کی کا ایک اور ادھار زامش فر سے منکرو ایا اور سہ رات دینہ تک پیتے رہے اس دوران میں لمبے وقفوں کے بعد نور جہاں کا ذکر جھپڑ جاتا تھا۔ میں نے شوکت کی گفتگو سے پتیجہ اخذ کیا کہ وہ ابھی تک اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ بھائی والہ معاملہ تو محض حکمت عملی تھا۔ اس کو وہ رات میں یاد آ رہی تھیں جب تھوڑی کی شخصی منی شہزادی اس کی آغوش میں ہوتی تھی۔ اور جب تمابا دنوں ایک دوسرے سے جدائہ ہونے کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

میں نے ایک دن شوکت سے پوچھ دیا۔ ”دیکھو بار تباہ!

بچو پسح تباہ! اکی نتمیں نور جہاں سے محبت نہیں ہے؟“

شوکت نے زور سے اپنے سکریٹ کی راکھ سمجھاڑی اور کسی قدر کھسپا نے پن سے کہا۔ ”ہے یار۔۔۔ ہے۔۔۔ مگر لعنت بھیجو

اس پر۔۔۔ میں اس کو آہستہ آہستہ بھول جاؤں گا۔۔۔“

لیکن قدرت نیلہ سکراہ بھی تھی، دوجو فیصلہ کر چکی تھی،

اٹل تھا۔ شوکت کا نہ لیکٹ سیبھوڑی۔ ایم دیاں سے ہوا۔ جر اس سے پہنے ایک فلم کے لیے نور جہاں سے معاہدہ کر چکا تھا۔

اب لگے ہانقوں سیبھوڑی۔ ایم دیاں کے متعلق بعضی مُسَن لمحیے۔

یہ ایک کامیاب آدمی ہے۔ نہ روئے شروع میں بلکہ تھا۔ پھر کمیرہ قلی ہوا۔

آہستہ آہستہ کیمپر میں بن گیا۔ ترقی کے اور نینے ملے کیے تو دارکش
کا موقع مل گیا۔ بیان سے چپلانگ لگائی تو پروڈیوسر ایپ وہ دارکش
اور پروڈیوسر ہے اور لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔

بہت ہی مخفی قسم کا انسان ہے۔ مجھ سے بھی کہیں پکدا۔ اتنا
پکدا کہ اُس سے تمیص کے بیچے ایک موٹا اونی بیان پہنچا پڑتا ہے
کہ اس کی پلیاں لوگوں کو نظر نہ آئیں۔ مگر بلکہ اس کا پھر نیلا ہے اور بڑا
محنتی۔ اس کے مقابلے میں پسلوان تھا جب میں گئے مگر وہ دُٹھا ہے
گا۔ جیسے مشقت اس پر اثر انداز ہو سی نہیں سکتی۔
اس کی ایک خوبی اور ہے کہ وہ اپنے ذاتی ہر ماٹے سے فلم نہیں
بناتا۔ ایک فلم تیار کر کے اور اس کو ٹھکانے لگا کہ وہ اپنے دوسرے
فلم کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس وقت کے بخت اور بچے تاکے
ہوتے ہیں وہ اپنی کاست میں جمع کر لیتا ہے۔ کہانی کا اصل وقت
نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی "فائل نیشنر" اس کے دام
میں آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے روپیہ لے کر وہ "کالی" کا نام
کر کا ہم شروع کر دیتا ہے۔

نور جہاں بمیٹی آئی تو اس کو پتہ چل گیا چنانچہ اس نے فوراً ہی نور جہاں
سے کنٹریکٹ کر لیا۔ اس یہے کہ وہ جانتا تھا کہ "خاندان" اور دوسرے
فلماں کی قابلِ رشک کا میابی کے بعد اس کا نام ہی کسی "فائل نیشنر"
کو بجا لئے یہے کافی ہے۔ اور سبب اس کو معلوم ہوا کہ خاندان
کا فائرنر کڑھی بمیٹی میں موجود ہے تو اس کی باج پھیں کھل گئیں۔ اس

تے فوراً اپنے کارندے سے دوڑا شے۔ شوکت حسین رضوی سے کئی
دلائافتیں کیں اور اس کے ساتھ بھی ایک پچھر کا معاہدہ کر لیا۔

فلیم کیا ہو گا؟ کیسا ہو گا؟ کہاں کیا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہ
نہ ہا۔ مگر سبیٹھ دی ایم دیاں نے جب اپنے، فائی نیسر، کو نور جہاں
اور شوکت سے اپنی "سن رائیز پچھر" کے گنڈلکٹ دکھائے تو
مطہوہ سرایہ کسی وقت کے بغیر فوراً مل گیا۔

قدرت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ نہ شوکت کو معلوم تھا کہ
نور جہاں "سن رائیز" میں آ جکی ہے اور نہ نور جہاں کو پتہ تھا کہ اس
کا عمدالتی بھائی شوکت بھی اس کا ہمراہی ہے۔ بڑی لمبی داستان
ہے۔ میں اس سے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن یہ راز فاش شد ہو گیا۔ نظامی بہت لگبرایا کہ ایسا نہ ہو
بنا بنا یا کھیل بکڑ جائے۔ جو فلم شوکت کو ڈائرکٹ کرنا تھی، اس کی
ہیروئن نور جہاں مقرر کی گئی تھی۔ دونوں کا "محیپریں" نظامی کے لیے
بڑا اندر وہناک ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ نور جہاں کے والی کی
حیثیت سے اس نے سبیٹھ دیاں سے کہا کہ وہ ہرگز ہرگز اس قسم کا
سلسلہ برداشت نہیں کرے گا۔ مگر سبیٹھ دیاں نظامی سے کچھ زیادہ
ہی کا بیاں نہ کلا کہ اس نے اپنی گجراتی حکمتِ عملی سے جو کہ پچابی
حکمتِ عملی کے معاملے میں بڑی گمراہی اور دھانسو قسم کی ہوتی ہے،
نظامی کو سہوار کر دیا اور وہ راضی ہو گیا کہ نور جہاں شوکت کی پچھر میں
کافرنگے گی۔ اور ضرور کرے گا، جس سے ادھ کو دنا اُدھ۔

جائے۔ چنانچہ وہیں دفتر میں دونوں نے ایک دوسرے سے معاونت کیا۔ ہاتھ ملائے اور ایک دوسرے کے بھائی بن گئے۔ اب سے دونوں اپنی اپنی حکم پر خوش تھے۔ سیٹھ و یاس اس لیے کہ اس نے اپنا اتوسیدھا کر لیا تھا، اور نظمی اس لیے کہ اس نے ایک فسلی سیٹھ کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اور اس کو زیرِ احسان کر لیا تھا۔ سیٹھ و یاس کٹر قسم کا وشنو تھا۔ ورنہ نظمی اسے اسی رات گھر بلاؤ کر ممتازہ ثانیتی کے باختہ کے پکے ہوئے مرغ اور پلاؤ سے اپنی اور اس کی دوستی ضرور مستحکم کرنا۔ اور اگر سیٹھ بوتل کا رسیا ہوتا تو وہ اپنے مریل مینجر کے ذریعے سے دو عدد سکارچ بلیک مارکیٹ سے ضرور منگلواتا۔

بھر حال بات پکی ہو گئی۔ کیونکہ نظمی سینے پر ہاتھ رکھ کر سیٹھ و یاس سے کہہ چکا تھا کہ "سیٹھ! اب جیکہ تم نے مجھے بھائی کہہ دیا ہے۔ میں تم کو بھی دیتا ہوں کہ میں یا آندھی یا... طوفان بھی ہو۔ تمہاری شومنگ ہو گی تو بے بی نور جہاں وقت پر پہنچے گی۔"

اب ایک لطیفہ سئیئے۔ بات تو خیر پکی ہو گئی تھی۔ میرا بھی سیٹھ و یاس سے ایک کہانی کے لیے کٹر مارکیٹ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں اور شومنگ اس کا موضوع تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ "پیشگیاں" بیل جکی تھیں۔ اس لیے ناسک کی ہرن مارکہ و سکی کی فراوانی تھی۔ دور پر دور چلتے تھے۔ مزہ اشرف، چاولہ اور سہنگل (یہ دونوں حضرات اب بڑے ڈاکٹر بن چکے ہیں) ہماری اردنی میں ہوتے تھے،

ذرا و سکی ختم ہوئی اور چاولہ بنا گئے ناگ پاؤں کے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی تو مرتضیٰ امیر شرف حاضر تھے۔

لطیفہ میں سے لطیفہ لکھتا ہے۔ مرتضیٰ امیر شرف ہمارے ساتھ پیتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ تیسرے پاک کے بعد رونا شروع کر دیتے۔ زار و فطار رد تے تھے۔ شوکت کے ہاتھ پاؤں پھوٹتے اور وہ شکوک جو شوکت کے دل میں ان کے بارے میں کم جھی گز رے کے لیے نہیں تھے، ان کا ذکر کرتے اور کہتے تھے کہ وہ سب عطا ہیں۔ اس کے بعد وہ رو رکر اپنی نسی بیان ہتا ہیو می کو باد کرنے لگتے تھے۔ اور پھر گانا سنانا شروع کر دیتے تھے۔ یہ سب فرادِ عینی جعل تھا۔ مگر فلمی دنیا میں اس کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے؟۔

اب میں اصل لطیفہ کی طرف آتا ہوں۔ کہ وہ اس مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ ہے۔

سید محمد دیاس اپنی فلم کی شوٹنگ کر چکا تھا۔ جو سین فلمائے گئے تھے۔ ان میں نور جہاں نہیں تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں شوٹ اور نور جہاں کی ابھی تک صحیح معنوں میں ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک رات نوٹس بورڈ پر یہ اعلان چیپاں ہو گیا کہ نور جہاں سینٹ پر آرہی ہے۔ اس کو باختاب طہ طور پر کمپنی کی طرف سے مطلع کر دیا گیا تھا۔ اسی رات کو میں گھومنتا گھا منتا ٹیکو اجی پارک میں رفیق غزنومی کے پاس چلا گیا۔ اس مشہور نشہ سانہ اور موسیقی تار کے پاس جس کی مختلف مایسوں کی تحریر ہوں میں مختلف قسم کے روان بند تھے ہیں۔

رفیق غزنوی میرادوست ہے۔ میرے اس کے بڑے ہی بے تکلف مراسم ہیں۔ میں اس کے فلیٹ پر ہمپا تو محفل جمی ہوئی تھی۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کیا دیکھنا ہوں کہ ایک صوفی پر تازہ ترین بیوی خود شید عرف انورادھا، سبھی ہے۔ اس کے ساتھ نور جہان ہے۔ ایک کرسی پر شرمی نظامی جی بر جہان ہیں۔ اور فرش پر ہمارے رفیق غزنوی صاحب یوں بیٹھے ہیں جیسے کسی سو منات پر حلقے کی تیاری کر رہے ہوں۔

رفیق غزنوی کے متعلق میں چند سطوروں یا چند صفحات میں کچھ لکھنے میں سکتا۔ اس کا شخص ذردار انسان دیکھنے میں کہ اس پر اگر کوئی ضمیحہ کتاب نہیں تو ایک طویل مضمون ضرور ہونا چاہیے۔ میں اپنے قارئین سے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ فرض بھی میں ایک نہ ایک دن ضرور چکاروں گا۔

رفیق میرادوست ہے۔ میں اگر کل کلاں ہوت کی آغوش میں چلا گیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد میری طرح سو گیا تو حقِ رفاقت کون ادا کرے گا۔ کون اتنے بڑے موسیقار، اتنے بڑے دلچسپ کردار کی داستانِ حیات بیان کرے گا۔ انشاء اللہ یہ میں کروں گا مگر وقت آنے پر خیر، یہ جملہ مختصر فہم تھا۔۔۔ رفیق۔۔۔ سو منات پر اپنے تازہ ترین حلقے تیاری کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ نظامی اس سے غافل تھا۔ یا نہیں۔ یا نور جہان کو اس کے ارادوں کا علم تھا۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

مجھے نظامی سے اتنا معلوم ہوا کہ ممتاز (شانتی) ابھی آنے ہی
والی ہے میں جریان تھا کہ ادھر شوٹنگ ہونے والی ہے۔ ادھر
اسکاچ کے دور چل رہے ہیں۔ نظامی کے ہاتھ میں گلاس تھا۔
نور جہاں بھی ہو لے ہوئے خوشترنگ مشرد ب اپنے ہوٹوں
سے چوس رہی تھی۔ خورشید عرف انورادھا تو خیر پختہ کارٹر بیو
کی طرح گھونٹ بھرتی تھی۔ اور رفیق۔ غزوہ کار رفیق۔ اس غزوہ کا
جس نے محمود پیدا کیا تھا اور جو ایک ایاز کی محبت میں گرفتار تھا۔
گلاس زمین پر رکھے میراثیوں کے لطیفے سنا رہ تھا۔

میں جب اندر دا خل ہوا تو اس نے حسب عادت استقبال کے
طور پر ایک بھاری بھر کم گالی اپنے منز سے آگئی۔ لیکن پھر فوراً ہی
رش لفیا نہ لب انجہ احتیاہ کر کے مجھ سے کہا۔ ”جانتا ہوں؟“
میں نے جواب دیا۔ ”جانتا ہوں۔“

رفیق چار گپ پینے کے بعد عاصم طور پر شرابی ہو جاتا ہے۔
لکھت بھرے لبھے میں اس نے مجھ سے کہا۔ ”نہیں! نہ کچھ نہیں
جانستے منٹو۔ یہ نور ہے۔ نور جہاں ہے۔ سرو جہاں ہے۔
خدا کی قسم! الیسی آواز پائی ہے کہ بہشت میں خوش الحان سے
خوش الحان حُمدہ بھی سنئے تو اسے سیند ور کھلانے کے لیے
زمیں پر اتر آئے۔“

میں جانتا تھا کہ وہ تعریف کے یہ پل کیوں باندھ رہا تھا۔
درachi ان پاؤں کے ذیلیے ہی وہ نور جہاں کے جسم تک پہنچنا

چاہتا تھا۔ مگر ہیں نے دیکھا کہ نور جہاں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ ملتی۔ وہ رفیق کی یہ باتیں سنتی تھی اور اسے خوش کر لے کے یہے ایک محسنو عی مکار ہے اپنے ہمٹوں پر پیدا کر لیتی تھی۔ رفیق اول درجے کا کنجوس ہے۔ مگر اس دن اس نے غیر معمولی فیاضی کا منظہ ہرہ کیا۔ بوتل میں سے میرے یہے ایک بہت بڑا پاگ عنایت کیا اور اصرار کیا کہ میں اسے ایک ہی جرے سے میں ختم کر دوں۔ تاکہ ایک دوسرا جبی رہ پے۔

سب پی رہے تھے۔ نور جہاں کا پاگ بہت بڑا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کے ذریعے چوں رہی تھی۔ جیسے کہیاں پھولوں سے آہستہ اور ہو لے ہو لے رس پوستی ہیں۔

رفیق، نور جہاں کی تعریف و توصیف کے مزید پل باندھ رہا تھا کیونکہ پلے پل سب لٹوٹ گئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بھی۔

خود شید عرف انورادھا نے اپنے دبليے پتلے مگر خوبصورت ہاتھ سے ٹیلی فون کا چونگا اٹھایا اور کان کے ذریعے سے روسری طرف کی آواز سنی اور سپیٹاسی گئی۔ فوراً چونگے کا منہ بند کر کے نور جہاں سے مخالف ہوئی۔ دسیطھ دیاں ہیں۔

نظمی نے کسی قسم کی پرائیویٹی کا اظہار نہ کیا اور کہا۔ بدیا! کہ دو کہ نور جہاں ان کے یہاں نہیں ہے۔

خود شید عرف انورادھا نے سپیٹھ دیاں سے مناسب و

سوزوں الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔“

جب بیکی فون کا سلسلہ ختم ہوا تو رفیق نے خورشید سے کہا۔ ”شیداں۔ ! جاؤ، اندر سے ہار مونیم لاو۔“ سپیٹھے

دیاں جائے جہنم میں۔“

شیداں اندر گئی اور ہار مونیم کی پیٹھی پر آئی۔ رفیق نے اس کو کھولا۔ اس کا ڈھکنا اٹھایا اور ہوا بصر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک سُرچھیرا اور خود ہبھی حجبو منے لگا۔ ” ہائے۔ سبحان اللہ!

واہ!“

دیر تک وہ بابھے کے مختلف سُروں کو چھپھڑ کر ” ہائے، سبحان اللہ، اور واہ واہ“ کرتا رہا۔ میرا خیال ہے رفیق پر علامہ اقبال کا یہ مصروف صادق آتنا ہے سے

دیتے ہیں سُرور اول، لاتے ہیں شراب آخر

گانے سے پہلے ہبھی رفیق سامنے پر وجد طاری کر دینے کا عادی ہے۔ مگر اس دن وہ نہ گایا۔ اس لیے کہ اس کی ساری توجہ نور جہاں پر ہوتی۔ ایک سُرچھیر کر اس نے نخور آنکھوں سے نور جہاں کی طرف دیکھا اور درخواست کی۔ ” نور۔ لبیں ہو جائے کوئی چیز۔

ہائے کتنا پیارا اور مدھر سُر ہے۔“ حلوقاً

آپ پردے پر ایکیڑ، ایکیڑ سوں لگے ڈڑھے دیکھتے ہیں اور ان کی کردار نگاری سے متأثر ہوتے ہیں۔ میں آپ کو اس ڈڑھے کی ایک جھاک دکھاتا ہوں۔ جو اس روز وہاں کھیلا گیا۔ جیتنے جائے

سوفیہ شیدی حقیقی ڈرامے کی جملک -

نور جہاں نے ہار مونیم صوفیے پر رکھ لیا۔ اس کے پاس خورشید عرف انور ادھاوسکی کا گلاس ہاتھ میں لیے بیٹھی ہے۔ رفیق غزنوی قالمین پر آلتی پالتی مارے نور جہاں کی طرف اپنی عشق پیشہ آنکھوں سے دکیا ہے رہا ہے۔ اور گانا سننے سے پہلے ہی جھوہم رہا ہے۔ دائیں ہاتھ کر کی پر شری نظامی جی بر اجہاں ہیں اور ان کے ساتھ ہی خاکسار ہے جو اپنا دوسرا پل پل رہا ہے۔

نور جہاں گانا شروع کرتی ہے۔ غالباً پیلو کی ٹھمری ہے۔

تورے نیں کا جوبن کارے

کہ ایک موڑ ہو لے سے پوری محیں رکتی ہے۔ ایک صاحب اس کے اندر سے نکلتے ہیں اور بیدر تھے اندر چلے آتے ہیں —
یہ سیٹھ ویاس ہیں۔

ایک لحظہ کے لیے سب بوکھلا جاتے ہیں۔ مگر نظامی فوراً ہی حالات پر فابور پال دیتا ہے۔ سیٹھ ویاس کی آمد سے گویا بے خبر وہ چلا کر خورشید سے کہتا ہے۔ ”بیٹا! یہ کیا ظلم کر رہی ہوئم۔ اسے اتنی لکھیف ہے اور تم اسے گانے پر مجبوو رکر رہی ہو۔ دیکھو! ایک بول گانے کے بعد اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔

بچروہ نور جہاں سے لشوشیش بھری آواز میں کہتا ہے۔ ”لیٹ جاؤ نور جہاں — لیٹ جاؤ۔“ اور وہ آگے بڑھ کر اسے لٹا دیتا ہے نور جہاں زور زور سے کرامنا شہ و ع کر دیتے۔ سے رفتہ رکھ راٹھ

کر انہتائی تشویش کا انظہار کرتا ہے۔ نظامی خورشید سے مخاطب ہوتا ہے، کسی قدر تبیر لجھے میں۔ ”شیداں! اٹھو، بیچھی کیا سوچ رہی ہے، جا جلدی سے گرم پانی کی بوتل لا۔ بڑے زور کا دورہ پڑا ہے۔“

شیداں اٹھ کر تبیر قدمی سے اندر چلی جاتی ہے۔ نظامی کراہتی ہوتی نور جہاں کو چپکارتا ہے، پھر سیڑھ دیاس سے مخاطب ہوتا ہے۔ ”بھائی جان! — وہ۔ وہ تکلیف ہے۔ وہی جو عورتوں کو ہوا کرتی ہے۔“

سیڑھ دیاس خاموش رہتا ہے۔ میں بھی دھم سخود ہوں۔ نظامی ایک بار پھر کراہتی ہوتی، دوسری ہوتی نور جہاں کو چپکارتا ہے اور سیڑھ دیاس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ ”کل سے غریب درد کے مارے چیخ دتاب کھا رہی ہے۔ مجھ سے کہتی تھی۔ چھا جان! مجھ سے شوٹنگ نہ ہو سکے گی۔ پرہیز نے کہا۔ نہیں بیٹا! یہ بڑا شگون ہے۔ یہاں بمبی میں یہ تکہاری پسلی پچھر ہے اور پھر شوٹنگ کا پیلان۔

یہ بھی چھوڑو۔ سیڑھ دیاس مجھے اپنا بھائی کہ چکا ہے۔ تم مر جاؤ مگر ضرور جاؤ۔ چنانچہ ہم اسی لیے یہاں آئے تھے کہ رفیق سے تھوڑی نسی برانڈی لیں اور اس کی کار لے کر اٹھو پہنچ جائیں۔ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ آپ کا نقشان میرا نقشان ہے۔ نور جہاں ابھی پہنچتی ہے۔ آپ میرے بھائی ہیں۔

سیٹھ دیاں خاموش رہا۔ — نظامی کے سوا اور سب
خاموش تھے۔ رفیق غزنوی دانستوں سے اپنے ناخن کاٹ رکھتا۔
میں گلاس ہاتھ میں میلے سورج رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟
کہانی میری تھی۔ میوزک رفیق غزنوی دے رہا تھا۔
اور سیٹھ دیاں، ہمارا آقا، عین موقعہ پر پہنچ گیا تھا۔ جبکہ
سم رنگ ریال منار ہے تھے۔ رنگ ریال ہی تو تھیں۔
اور کیا تھا۔ وسکی کا دور چل رہا تھا اور نور جہاں گا رہی تھی۔
— تو رے نہیں کہ جربن کارے
اچھا خاصاً مجرماً ہو رہا تھا۔

نظامی نے اپنے مخصوص انداز میں سیٹھ دیاں سے کچھ
اور باتیں کیں اور اسے یقین دلا یا کہ جب دونوں ہی ایک
دوسرے کو بھائی کہیں چکے، میں تو دلوں میں کوئی قسم کے شکر
شبہ کی گنجائش نہیں ہوئی چاہیئے۔

انتہے میں خود شید گرفم پانی کی بوتل لے کر آگئی۔ جو
نور جہاں کے پیٹ پر رکھ دی گئی۔ اس سے اس کو کچھ کون ہوا۔
اس پر نظامی نے سیٹھ دیاں سے بھاول بنا بیٹھا تھا، کہا۔
”آپ تشریف لے چلئے، میں اور رفیق نور جہاں کو ساتھ لے کر
ابھی آتے ہیں۔“

ڈپرنس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے: خود شید بھی
ساتھ چلے۔ عورتیں عورتوں کے سب معاملات جانتی ہیں۔“

سیٹھ ویاس اٹھا اور اپنی لڈپی ٹھیک کرتا ہوا چلا گیا ۔ سب کے جان میں جان آئی۔ نور جہان نے اپنے پیٹ سے گرم پانی کی بوتل الگ کی، جو ٹھنڈے سے پانی سے بھری ہوئی تھی اور نظامی سے کہا۔ ”نظمی چھپا! آپ نے تو کہا تھا۔ مت جانا۔“ نظامی سنجیدہ ہو گیا۔ ”بیٹا! وہ میں نے نہیں کے بھلے کے لیے ہی کہا تھا۔ پہلے ہی دن آدمی شونگ پر چلا جائے۔ اور پروڈیوسر کو پیرے ذکر ائے تو وہ سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ اپنی ممتاز سے پوچھیو، جب تک سٹوڈیو سے گاڑی نہ آئے، ممتاز ہے جو وہ شونگ میں بائے۔ اور پھر جب گاڑی بھی آتی محل ہے تو وہ شونگ میں ہو جائے۔

ہے تو میں اسے کم از کم ایک گھنٹے نیچے کھڑی رکھتا ہوں۔ رائے بہادر چلنی لال میرے اتنے روست ہیں مگر میں ان کی بھی پرواہیں کرتا۔ بعض دفعہ تو ایسا تھی ہوا کہ وہ خود اپنی گاڑی میں ممتاز کو لینے آئے۔ بھر عال اب سب ٹھیک ہے۔ خود آیا ہے بیاں چل کر، اور پھر تم بیار ہو اور بیماری کی حالت میں جا رہی ہو۔ سیٹھ ویاس کو اس کا خیال رہے گا۔

نظمی نے کچھ دیر اور پروڈیوسر اور آرٹسٹ کے باہمی رشتے کی باریکیاں بیان کیں اور وہ تمام گروپ نے جو آرٹسٹ کو استعمال کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد گفتگو آہستہ آہستہ شوکت حسین رضوی میں تخلیل ہو گئی۔ نظامی اپنی باتوں سے زبردستی نور جہان کے دل و دماغ میں یہ خیال ٹھوٹنا چاہتا تھا کہ اب اس کو

اس شخص سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کے دل میں اب اس کے لیے کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اسے وہی راستہ اختیار کرنا چاہیے جس پر ہمتانہ شانتی اس کی ہدایات کے مطابق اتنے عرضے سے چل رہی ہے اور اتنا نام اور روپیہ پیدا کر چکی ہے۔

اس گفتگو میں مجھے بھی حصہ لینا پڑا کہ شوکت سے صہاف پر خانسی دوستی ہو گئی تھی اور وہ اس بات کا قرآن بھی لمحچکا تھا کہ اسے نورِ جہاں سے محبت ہے۔ اور میرزا مشرف سے بھروسہ کا سلسلہ جاری تھا، اس سے تو قطبی طور پر یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ دوسری عورتوں کی آنکش میں نورِ جہاں کی یاد کو دفن کرنا چاہتا ہے۔ اور ہر ان مارکہ جیسی مفترضہ کلاس و سکی سے اپنا غیر مخلوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اصلًا شوکت گھری ساز تھا اور اپنے فن میں مہارت تناہی رکھتا تھا۔ اس لیے وہ ہر شے کی نوک پلک درست کرتا رہتا تھا۔ اس کی طبیعت کسی الہمہ سے ہوئے پر زے کسی ٹیکھی کیلئے، کسی غلط وقت دینے والی گھری، کپڑے میں کسی شکن اور سلوٹ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کی جملت میں ایک منظر ہے۔ وہی منظم جو ایک اچھی گھری میں ہوتا ہے۔ مگر یہاں نورِ جہاں کے معاملے میں وہ خود کو بے لبس سمجھتا ہے۔ وہ اس گھری کے محل پر نہ سے کیسے درست کر سکتا تھا۔

جس کو دل کہتے تھے۔ اگر یہ کوئی ایسی چیز ہوتی جسے وہ اپنے سامنے رکھ کر محتسب شیشے میں دکھیل سکتا۔ اس کی بال کافی اور اس کی گراریوں کا مطالعہ کر سکتا۔ تو یقیناً وہ پنج کش لے کر اسے سب کا سب کھول دیتا۔ جو گڑ بڑ پیدا ہونے کا موجب ہو رہی تھیں۔ مگر یہ دل کا معاملہ تھا۔

اوپر نور جہان بھی جو اپنے گلے سے باریک سے باڑیک رُنگ کی نکال سکتی تھی، جیران بھتی کر اپنے دل سے شوکت کی یاد کیسے نکالے۔ وہ خیال بڑے استادوں کی طرح گا سکتی تھی۔ مگر ایک خیال اس کے دل و دماغ پر ہر وقت چاپا رہتا تھا۔ اور یہ خیال اس کے محبوب کا تھا۔ پانکے چھپلے شوکت کا۔ جس نے اس کی زندگی کو بہترین لذت بخشی تھی۔ جس نے اس کے بدن میں وہ حرارت پیدا کی تھی جو موسقی جیسی لطیف چیز بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اُسے کیسے کھول سکتی تھی۔ وہ جو اس کے جسم میں ایک سورصہ تک ڈیکھیا لگتا رہا تھا۔

شوکت کے متعلق گفتگو شروع ہوئی اور نور جہان نے اپرے دل سے اس کے متعلق اپنی نفرت کا اظہار کیا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے س سے کہا:

”نور جہان! یہ سب بکواس ہے۔ جو کچھ پر نہ نے کہا ہے۔ خدا کی قسم وہ تمہارے دل سے نہیں انکھیا اور جو کچھ ہیں اس

خرزاد شوکت سے سنتا ہے۔ خدا کی قسم! وہ بھی قطعاً
 جھجوٹ ہوتا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے پر ہرتے
 ہو۔ مگر دونوں بھی فریب ہو۔۔۔ ابھی کل مصروف کے ذفتر
 میں تھا رہی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور۔۔۔ کل شام کیا۔۔۔ ہرثام
 جب میں اور شوکت پینا شروع کرتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی بھی
 تھماری بات چھپڑ دیتا ہے۔ پر خود ہی گفتا ہے کہ اس کی بات
 نہ کرو۔۔۔ بھی حال تھا رہا ہے۔ میں نے تھماری یاد میں اس
 کی آنکھوں میں آنسو بھی رکھئے ہیں اور میں تھیں یہ بھی بتا
 دوں تو کہ وہ اگر تم سے دور رہے، تو وہ اپنی بھانی اور اپنی
 صحت تباہ کر لے گا۔ وہ تھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا
 معلوم نہیں، تم نے اس پر کیا جادو پھونک رکھا ہے۔۔۔
 نور جہاں پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔

میں نے پھر کھنا شروع کیا۔ "نور جہاں! خود فریبی سے
 کام نہ لو۔ میں مانتا ہوں کہ نظامی صاحب بڑے جہاندیدہ آدمی
 ہیں۔ لیکن عشق و محبت میں وہ گروکھبھی نہیں چلتے، جو
 نہ گی کے دوسرے بازاروں میں چلتے ہیں۔ یہ کھوٹے کے
 ہیں۔۔۔ میں ایک دم نظامی سے مخاطب ہوا: وہ کیوں نظامی
 صاحب! کیا یہ جھوٹ ہے۔۔۔"

نظامی صاحب کچھ ایسے پیری تقریبہ میں گم نکے کہ انہوں نے
 جس نفی میں اپنا سر بلایا تو انہیں مطلق اس کا احساس نہیں

نقا۔ پھر جب ایک دلچسپ کے ساتھ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نور جہاں سے جس کی آنکھوں میں اب آنسو تیر رہے تھے، کہہ رہا تھا، وہ تم دونوں بے وقوف ہو۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو۔ مگر اسے چھپا پائے ہپر تے ہو۔ کس سے؟ کون سے!—
— یہ دنیا تو معااف کرنا نور جہاں، کسی کو بھی محبت کرتے نہیں دیکھ سکتی۔— لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ لوگ محبت کرنا ہی چھوڑ دیں۔— ممتاز شانستی کی زندگی واقعی قابلِ رشک ہے۔ نظامی صاحب جیسے شینیق اور ہوشیار چھاپ کی سر پرستی میں وہ یقیناً ندا کے فضل و کرم سے اور بھی ترقی کرے گی۔ لیکن— (جہاں میں پھر نظامی سے مخاطب ہوا)۔“ لیکن نظامی صاحب! آپ سے یہ مخفی نہیں ہو گا کہ ہر آدمی کے لیے ایک ہی چھاپ کا مم نہیں دے سکتا۔ آپ نے جو بدایات ممتاز کے لیے مسحی یقین، ظاہر ہے کہ وہ نور جہاں کے لیے کار آمد نہیں ہو سکتیں۔ دونوں کے مزاج میں زین و آسمان کا فرق ہے۔
کیا میں چھوٹ کہتا ہوں؟”

میں اب نظامی کو اس مقام پر لے آیا تھا جہاں وہ میری کوئی بات جھٹکا نہیں سکتا تھا۔ میں نے موقع غنیمت بانا اور بوتھا چلا گیا۔ میں نے نور جہاں کے دل ددعاش پر جو کہ

اُس کے لیے غالباً پہلے ہی سے تیار تھا، یہ حقیقت اچھی طرح مفہوم کر دی کہ وہ اور شوکت ایک دوسرے کے لیے بُشے ہیں اور یہ جو خود فریبی سے کام لے رہے ہیں، بڑی مہلک پیز ہے۔

نظامی جب اٹھا تو وہ کوئی خوش آدمی نہیں تھا (اس جملے میں انگریزی پن سے مگر یہ مجھے پسند ہے) مگر اپنی فطرت سے مجبور وہ مجھ سے روکھے پن کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے نور جہاں سے یہ کہہ کر کہ وہ ٹھنڈی بوتل کی بجائے گرم بوتل لے کر خورشید کے ساتھ سٹوڈیو چلی جائے اور وہاں وقتاً فوقتاً درد کا بہانہ کرتی ہے۔ تو اس نے بڑی خواہ پیشانی سے مجھ سے گفتگو کی اور مجھے یقین دلا یا کہ میرے فلیٹ اور فریض پر وغیرہ کا مکمل بند ولیست کر رکھا ہے۔ اس کو حیرت لختی کہ میں اتنے دنوں کہاں غائب رہا۔ فلیٹ کی چالی اس کے مینجر کے پاس تھی اور وہ میرا منتظر تھا۔ بالیک مارکیٹ سے پڑول حاصل کرنے کے لیے بھی انہوں نے ولیاں بھی مکمل انتظام کر چکرا دھا۔ اس کے علاوہ ان کی دلی خواہش لختی کہ میں ان کی دعوت قبول کروں جس میں وہ میری تواضع علاوہ مرغبوں کے "جو نی واکہ کی بلیک لیبل" سے کریں گے۔

میں نے مناسب و موزوں الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا، لیکن وہ مصروف تھا کہ میں ضرور اس کی دعوت قبول کروں۔

چنانچہ میں نے قبول کر لی۔ مگر مجھے یقین تھا کہ اگر میں اس کے
ہاں پلا بھی گیا تو مرغ اور سمنی واکر بیک لیل کا ذکر نہ کبھی
نہیں ہو گا۔

خیر! نظامی صاحب کو چھوڑ دیئے کہ وہ نظامی صاحب
ہیں۔ معلوم نہیں کس رعایت سے۔ ممکن ہے۔ حسن
نظامی دہلوی کے مرید ہوں یا خود ساختہ نظامی ہوں۔ مجھے
صرف یہ بتانا ہے کہ میری اس شام کی تقریبہ نما گفتگو نے
نظامی کے تمام پلان درست برسم کر دیئے۔

مجھے معلوم ہوا کہ نور جہاں اب کمال امر وہی سے کوئی چیز
نہیں ہوتی۔ اس کے ٹیکی فون آتے ہیں۔ مگر وہ کوئی جواب نہیں
دیتی۔ وہ اپنی سیکنڈ ہینڈ کار لے کر آتا ہے۔ مگر وہ کسی
کرے میں چھپ جاتی ہے اور نظامی کی ہدایات کے مطابق عمل
نہیں کرتی۔

ان تمام باتوں کی رپورٹ میرے ذریعے سے شوکت تک
پہنچ جاتی تھی۔ ہمیں اس بات کا کامل احساس تھا کہ وہ مرد
تھمہ پا نظامی کے شکنجه میں ہے اور اس کا وہاں سے نکلنا
مشکل ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک کافرنس کی۔ جس میں نذیر لدھیانوی
ایڈ پریوریکلی، میں اور شوکت شامل تھے۔ ملے ہوا کہ وہیں یعنی
کبڈی روڈ پر کوئی مکان حاصل کیا جائے۔

نذیر لدھیانوی کی کوششوں سے کبڈی روڈ پر ساحلِ سمندر

کے بالکل قریب گراونڈ فلور پر ایک نہایت عمدہ فلیٹ مل گیا، جس میں تین غسل نانے تھے۔ کمی کرے تھے اور ایک وسیع و عریض ڈرائیور روم تھا۔

ندرے نے جو کہ ۱۰۰ لفی چیمز جیسے و اپیات فلیٹ میں رہتے رہتے آتا گیا تھا۔ شوکت سے کہا کہ وہ شرکت کرنے کے لیے تیار ہے۔ دونوں اکٹھے رہیں گے۔ چنانچہ فوراً فلیٹ حاصل کر لیا گیا۔ کرایہ غالباً ایک سو پیسٹر روپے یا دو سو روپے مہوار تھا۔ فریچر اور دوسرے ساز و سامان سے چند دن کے اندر اندر یہ جہازی فلیٹ سجا دیا گیا۔ شوکت کا بیڈ روم سمندر کی طرف تھا۔

ادھر سے اگر پانچ سو قدم کا فاصلہ طے کیا جاتا تو نظامی کا فلیٹ آتا تھا۔ مطلب یہ کہ اب نور جہاں اور شوکت میں سرف اتنے ہی قدموں کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

میرے ذمے جو کام تفنیں کیا گیا تھا، وہ میں خوش اسلوب سے نجاح رہا تھا۔ کبھی کبھی نظامی کے ہاں جانکلتا تھا۔ اور اگر نور جہاں موجود ہوتی تو اس کو بتا دیتا تھا کہ شوکت نے کتنی آہیں اس کے لیے بھری ہیں اور رات کو پینے کے بعد وہ کتنی مرتبہ اس کے فراق میں رویا ہے۔

نور جہاں کو میرے ذریعے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ شوکت اس کے پڑوس میں مقیم ہے اور یہ کہ صرف پانچ سو

قدم ساحل کے ساتھ چل کر وہ اس کے پاس پہنچ سکتی ہے،
یا وہ اس کے پاس — بیر کی سیر اور دیدار پر یاد ہبھی۔
میں نے کئی دفعہ محسوس کیا کہ یہ کام جو میں کر رہا ہوں
کسی بوڑھی کٹنی کا ہے۔ مگر دوست کے لیے آدمی کیا کچھ
نمیں کوتتا — ؟

یہاں میں آپ پر یہ واضح کر دوں کہ میں دونوں کی
شادی کے سخت خلاف تھا۔ ایک درس سے شادی کا سلسلہ
ہی میر سے نہ دیکھ نہ لے بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے
کے ساتھ رہیں، لیس بھیک ہے۔ جب اُکتا جائیں تو
اپنا اپنا راستہ لیں — مگر شوکت پڑھ کھوانے کا قابل
تھا کہ زمین ساری عمر اُسی کی ملکیت رہے۔ میں نے
اُسے بہت سمجھایا۔ وہ مان گیا۔ کہ اگر نور جہاں سے اس
کا ملاپ ہو گیا تو وہ شادی نہیں کرے گا۔

مجھے جو کرنا تھا، کر چکا تھا۔ میں اب اپنی کمائی کا
جس کا عنوان "لوکر" تجویز ہوا تھا، منظر نامہ لکھنے میں بے
طرح مصروف تھا۔ اس کے علاوہ کیڈل روڈ اور باقی کلمہ
میں کئی میل حاصل تھے، اس لیے شوکت کے ہاں میرا
آنا جانا کم ہو گیا۔

ان دنوں اچھی بیرونیاب تھی۔ اتفاق سے امریکی بیر
کی چار فربہ انداز بونتیں مجھے مل گئیں۔ میں یہ ساتھ لے کر

کیڈل روٹ پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ مشروب ناشتے ہی سے شروع کیا جائے۔

جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ منت سنسان ہے۔ نذیر لدھیانوں نہ دھوکہ اور ناشتہ کر کے دفتر روانہ ہو چکا ہے اور شوکت سورہ ہے۔

میں اس کی سخا بگاہ کے پاس پہنچا اور دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر فرمادور سے دروازہ کھٹکا ہٹا یا۔ اندر سے شوکت کی سخا آؤ داڑ آئی۔ ”کون ہے؟“

میں نے جواب دیا۔ ”مشٹو“

شوکت نے کہا۔ ”بھڑو!“

میں بھڑا رہا۔ تین منت کے بعد دروازہ کھلا۔ کمرے کے اکتوتے پلنگ پر نور جہاں لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ ”انقلاب زندہ باد!“

نور جہاں کی آنکھیں ایسے معلوم ہوتا تھا کہ انہی انہی وہ لانڈرمی سے دھل کے آئی ہیں۔ میں نے شوکت کو دیکھا کہ وہ کسی قدر مضغم تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تو جنور گڑھ فتح ہو گیا۔“

شوکت مسکرا دیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ اطمینان بھری تھی۔ کہنے لگا۔ ”آف بیٹھو!“

میں ان کے پلنگ کے پاس ڈرینگ ٹیبل کے اسٹول پر

بیٹھ گیا اور شوکت سے مخاطب ہوا۔ "کیوں بھائی! یہ محترمہ
کیسے تشریف لا یں؟"

شوکت نے فاتحانہ نظرؤں سے نور جہاں کو دیکھا جو پنگ
پر چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھانپ رہی تھی۔ لبس کچے
دھاگے سے بندھی آئی ہیں۔"

معلوم نہیں وہ کچے دھاگے سے بندھی آئی تھی یا پکتے
دھاگے سے بندھی آئی تھی۔ پرس میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں
کہ وہ دھاگہ جیسا بھی تھا اس کی تنقیق باقتوں سے نہیں، دلوں
سے ہوئی تھی۔ پڑے سعده ملیتے سے ٹبا ہوا تھا۔ درجہ وہ پانچ
سو قدموں کا فاصلہ اتنی جلدی اور اتنی خوبی سے پالا نہیں
جا سکتا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ شوکت کے بیڈ روحم میں جس فرنچیر کی کمی
تھی، وہ پوری ہو گئی تھی۔ اور اب وہ مکمل طور پر سچ گیا تھا۔
لیکن اوہر نظامی کے فلیٹ میں ایک بیٹی بچہ گئی تھی۔ وہ بتی
جو ایک پورے سے بجلی گھر میں تبدیل ہو سکتی تھی۔

نظامی نے اسے بہت سمجھایا جھیا یا، جھائیوں نے اسے
بہت دھمکیاں دیں، پر حبِ عشق کا بہوت سر پر سوار ہوا
تو کافوں کے سارے دروازے سے بند ہو جانتے ہیں۔ دھمکیاں
اور سمجھکیاں، پن۔ و نصائح قطعاً انداز نہیں ہوتے۔

شوکت نے مجھ سے کہا۔ "منٹو! میرا خیال ہے، میں سالی

سے شادی کر داول۔“

میں نے پھر اس سے کہا: ” یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم اس کے مالک ہو، لیکن میری ایمان دارانہ رائے یہی ہے کہ تمہارا یہ اقدام درست نہیں ہو گا۔ کیا تم نے اس بارے میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کیا ہے؟“
اس سوال کا جواب شوکت گول کر گیا۔ برعکمال اب مجھے یقین تھا کہ وہ اب سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے گا اور عجلت سے کام نہ لے گا۔

بمبئی میں ایک بزرگ حکیم ابو محمد طاہر اشک عنظیم آبادی کے نام سے تھے۔ یہ ایک عجیب شے تھے۔ عمر آپ کی پچھتر برس کے قریب تھی، مگر دل جوان تھا۔ انکھوں کی بینائی باسکل درست تھی۔ دانت سلامت تھے۔ ہر نئے فلم کا پہلا شوڈ لکھتے تھے۔ پا پنج زبانیں بولتے تھے۔ اردو، فارسی، عربی انگریزی اور بنگالی۔ بڑے معرکے کے آدمی تھے۔ طبابت سے شف فنا! اور شعرو شاعری سے بھی۔ شوکت سے میں نے ان کی ملاقات کرائی تو وہ ان کے گردیدہ ہو گئے۔ اور ان کو چھپا جان کہنے لگے۔

حکیم سا سب نے ان سے دور دراز کا کوئی رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق وہ شوکت کے خاندان سے بہت پرانے مراسم رکھتے تھے۔

ہاں میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ بائی کلہ اور کیٹل روڈ میں فاصلہ کافی تھا۔ اس کے علاوہ میں کہانی کی منظر نوایی میں مشغول تھا۔ چند دن گزرے تو حکیم صاحب تشریف لائے۔ مجھے ان سے بڑی عقیدت تھی کہ میری زبان درست کرنے میں آپ نے غیر شعوری طور پر میری بہت مدد کی تھی۔ ان کو ہبھی مجھ سے محبت تھی۔ کہ میں ان کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ باقاعدہ میں آپ نے مجھے بتایا کہ شوکت بیٹے کا نکاح نور جہاں سے ہو گیا ہے۔ میں بہت حیران تھا کہ مجھے اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

جب میں نے اپنی حریت کا انعام کیا تو حکیم صاحب نے سارا معاملہ گول کرنے کی کوشش کی۔ جب ناکام رہے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ « دلکھو سعادت ! یہ سب کچھ خفیہ طور پر ہوا ہے تاکہ لوگوں میں چرچا نہ ہو۔ میں نے تم سے ذکر کر رہا کہ تم بھی شوکت کی طرح میرے بیٹے ہو، اس لیے یہ راز را نہیں ہے۔ »

یہ راز کب تک راز رہ سکتا تھا؟ میں پچھتر برس کے دبڑے سے کیا بحث کرتا! غصہ تو مجھے صرف اس بات کا تھا کہ شوکت نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی؟ اگر اسے نکاح کرنا ہی تھا تو میری شمولیت اس میں کیوں ضروری نہ سمجھی؟ چیسا کہ میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں، شوکت کے

اور مجھے کیوں تاش کی گڑی میں سے جو کہ سمجھ کر الگ کر دیا گیا۔
میرے دل میں تکدد نقا، لیکن شوکت سے میں نے اس
کا ذکر نہ کیا کہ اس سے میرے اور اس کے تعلقات یقیناً
کشیدہ ہو جاتے۔
و ان گزرتے گئے۔

نظمی تھک بار کر مبیٹھ گیا۔ سید کمال حیدر امر وہی نے
پڑا رہا مرتبہ ٹیکی فون کیا۔ سینکڑوں صرتہ اپنی سکینڈ ہینڈ کار میں
نظمی کے فلیٹ کے چکر کاٹے، آخر وہ بھی نامید ہو کر دیگر
مشاغل میں مصروف ہو گیا۔

شوکت کا بیٹہ روم آباد نقا۔ وہاں ہنسی کے چھینٹے ہڑتے
تھے۔ نور جہاں کے گلے سے نورہ برتتا نقا۔ فیض غزنوی سے جس
قسم کی دعائیں بنوانی ہوتی تھیں، ان کی دیہر سل ہوتی تھی۔ وہ جوانیاں
کیڈل روڈ کے اس فلیٹ میں کھل کھیل رہی تھیں۔
میں آپ کو ایک نلیفہ سناؤں۔

میرے بھائی جان! سعید حسن بیٹھ، جنائز فتحی سے ایک
مدت کے بعد امرتسر جانے کے لیے تشریف لائے۔ انھوں
نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بذریعہ ہوائی جہاز آرہے ہیں۔ ان
دلوں میں میں ماہم میں رہتا تھا اور ہمارا فلیٹ بہت ہی
چھوٹا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا۔ مصتور کے
ایڈنیٹر نذیر لہٰ تھا نوی بھی موجود تھے۔ ملے یہ پایا کہ ان کو

اس فلیٹ میں ٹھہرایا جائے جہاں نذریہ اور شوکت دونوں
اکٹھے رہتے ہیں۔

یہ فلیٹ جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، بہت بڑا تھا۔
نذریہ چھپٹانک تھا۔ شوکت تھا، اس کی نور جہاں تھی۔
ان کو تو اب فقط ایک بیڈ روم چاہیے تھا۔ باقی کروں
سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے بھائی جان
کے لیے جو بورپی طرزِ رہائش کے عادی تھے۔ ایک علیحدہ
کے اور غسل خانے کا انتظام بڑی آسانی سے ہوتا
تھا۔ چنانچہ جب وہ بمبئی تشریف لائے اور چند روز
کے لیے وہاں رکے تو میں انہیں کیڈل روڈ پرے گیا۔
وہ یہ فلیٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عمارت قریب
قریب نئی تھی، جدید طرز کی، دو منزلہ تھی۔ اور پر کی منزل میں
صاحبِ مکان رہتے تھے۔ پچھلی طرف یعنی جدید سمندر کا
ساحل تھا، کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا باغچہ
تھا۔ اس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے جگہ رہتے تھے اور وہ
جنہیں انگریزی میں "سی سا" کہتے ہیں اور وہ پہنچنے والے
تحتے!

سمندر کی مطلوب ہوا ہر وقت آتی رہتی تھی۔ بعض اوقات
یہ اس قدر تیز ہو جاتی تھی کہ فلیٹ کے وہ تمام دروازے، وہ
تمام کھٹکیاں، جن کا لمحہ سمندر کی طرف تھا، بند رکھا پڑتی

تفیں کہ چیزیں اپنی جگہ سلامت رہیں۔

اسی نلیٹھے میں بھائی جان اپنے مختصر سے اسباب کے ساتھ اُترے اور بہت خوش ہوئے۔ لیکن چند ہی روز میں ایک ٹریجیڈی وقوع پذیر ہو گئی۔

شوکت نور جہاں کو دوبارہ پا کر بہت خوش تھا۔ اس خوشی کا انکاس کسی نہ کسی طرح نفسیاتی طور پر ہونا ہی سچا ہیئے تھا۔ پھر مرزا مشرف تھا، شوکت کی دیگ کا بہت بڑا چھپہ، چاؤلہ تھا سہ گل تھا اور درسرے سے بھتے جو شوکت کے فلم میں شرکیب ہوتے کے لیے بے قرار تھے۔

فلحی دنیا دراصل رات کی دنیا ہے۔ دن بھر یہ سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے اور سرِ شام شوکت کے ہال جمع ہو جاتے تھے۔ وسکل کے دور چلتے تھے، میو قیانہ قسم کی ہنسی ٹھیٹھے ہوتے تھے۔ گانے گانے جاتے تھے۔ کہانیاں کے سنائی جاتی تھیں اور بعض اوقات تو اتنا شورہ برباد ہوتا تھا کہ اوپر کی منزل والوں کو پکار پکار کر کہنا پڑتا تھا کہ بابا خاموش ہے۔

ایک رات شوکت نے غالباً ایم۔ اے مغل کو جو پریکھرہ نیم بانو کے ڈھنڈوچھی کی یونیورسٹی سے مشعور تھے۔ اپنے ہار مغو کیا۔ مرزا مشرف بھی تھے، میں بھی تھا اور میری بیوی بھی تھی۔ دعوتِ طعام سے فارغ ہو کر میں اور

میری بیوی تو فوراً چلے گئے کہ ہمیں ایک ضروری کام سے کہیں جانا تھا۔ بھائی جان شوکت علی کے بیٹے زاہد کے ہاں مدعو تھے۔ وہ دیر سے لوٹے۔ مگر جب انھوں نے ہاں میں قدم رکھا تو دیکھا کہ زندگی و مستقبل اپنے بال کھولے ناچ رہی ہے۔ وہ ہاوس ہو ہے کہ کان پڑی آوانہ سنتائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں، انھوں نے اور کیا کچھ دیکھا کہ صحیح ہوتے ہی اپنا سامان بندھوا کر خلافت ہاؤس چلے گئے۔ اور مجھے اور میرے دوستوں کو اس قدر چند و تیز لمحے میں برا بھلا کہا کہ اب ہمیں نے اس واقعہ کو یاد کیا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے کالوں میں پہلا ہوا سیساہ اُتر رہا ہے۔

انھوں نے اصل میں اپنی ساری زندگی قانون کی کتابیں میں گزاری تھیں۔ ساری عمر مقدمے لڑتے رہے تھے۔ لاہور میں، بمبئی میں، مشرقی افریقیہ میں اور جزائر فوجی میں۔ ان کو کیا معلم کہ فلمی دنیا کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے عاشق و معشوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سرپر پاؤں رکھ کر جاگے۔ اور خلافت ہاؤس میں جا کر پناہ لی۔ پر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ خلافت ہاؤس ایک الیسی گلی میں واقع ہے جس کا نام ”لو لین“ ہے۔ یعنی محبت کی گلی ہے۔

یہ قصہ تو خیر خمنا آگیا کہ زیبِ داستان کے یہے ضروری تھا۔ اب میں نور جہاں کی طرف لوٹتا ہوں۔ جس کی بڑی بہن وہیں کبڈل روڈ پر پاس ہی لپٹے بھائی کے ذریعے سے پیشہ کرتی تھی مگر ہر ایجنسی طور پر مجھے معلوم نہیں کہ یہ دونوں بہنیں آپس میں متین یا نہیں، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں، شوکت نے اس کی اجازت نور جہاں کو کہی نہ دی ہو گی۔

نور جہاں کا بھائی پلے درجے کا جواری تھا۔ تسلیہ کھیلتا تھا۔ تاش کے پتوں پر داؤ لگاتا تھا۔ ریسیوں میں جاتا تھا۔ اس کو ظاہر ہے کہ نور جہاں اور شوکت کا مlap سخت شاق گزرا تھا۔ جیسا کہ میں اس سے پیشتر عرض کرچکا ہوں۔ اس نے چھانٹامی سے مل کر بہت کوشش کی کہ وہ پھر ایک درسرے سے جدا ہو جائیں اور نور جہاں ان دلوں کی روزی کا پیشکرہ بن جائے۔ مگر یہ بیل منہ سے نہ چڑھی۔

شوکت کو ہر قسم کی دھمکیاں دی گئیں مگر وہ بھی ایک دبنگ آدمی ہے، اس نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ یہ مخالف بالکل خاموش ہو گیا۔

فلم "نوکر" کی شوٹنگ جاری تھی۔ رفیق اس کی موسیقی مرتب کر رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے کام میں پورے انہاں سے دلچسپی لیتا تھا، مگر میں صاف محسوس کرتا تھا کہ رفیق غزنوی

ہر وقت الجھن سی محسوس کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی عین ناک کے نیچے (ایہ بھی انگریزی محاورہ ہے) ایک اور شخص اس لونڈ یا کو اڑا لے گیا تھا جس پر اس کی عشق پیشہ آنکھ تھی۔

بھر حال فلم "نوکر" کی تکمیل اقتال و خیزان جاری تھی۔ اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ شوکت فلم سازی کے معاملے میں بے حد متلوں مزاح ہے۔ اس کو ایک آدمی کا کام پسند نہیں آتا۔ بلکہ یوں کہے کہ اس کو فقط ایک آدمی کے کام سے اطمینان نہیں ہوتا۔ میں نے اُس کو کہانی کا منظر نامہ معہ مکاموں کے لکھ کر دے دیا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ خفیہ طور پر کئی آدمیوں سے مکالمے لکھوار رہا ہے۔ ان میں ہمارے بزرگ اشک عظیم آبادی بھی تھے۔ مجھے بہت تاؤ آیا۔ جہاں تک اشک صاحب کا تعلق تھا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مگر دوسروں کو میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے بڑے گرم الفاظ میں شوکت سے اپنی شکایت کا انہمار کیا۔ آدمی سمجھ دار ہے۔ حکمتِ عملی سے کام لے کر اُس نے میرے دماغ پر برف کی کٹی سلیں رکھ دیں۔ مگر میں دل برداشتہ ہو چکا تھا کیونکہ کہانی بھی میری مرضی کے مقابلہ نہیں لکھی تھی۔ اور اس کے ہر کوئی اور ہر مرد پر شوکت نے اپنی

من مانی کی نتیجی۔
 میں بڑا ہٹ دھرم اور چند سی آدمی ہوں، لیکن شوکت
 کے سامنے میری کوئی پیش نہ چلتی تھی۔ اس کے علاوہ میں
 نے چند دن اس کے ساتھ کام کر کے قطعی طور پر جان لیا تھا
 کہ یہ شخص جو میرے ساتھ ہر مارکہ و سکی اور کریون اے کے
 سگریٹ پتیارہ ہے اور میری ہر بلت مانتا رہا ہے۔ فلم
 سازی کے معاملے میں وہی کچھ کرے گا جو اس کا گھری ساز
 ذماغ مناسب سمجھتا ہو گا۔ چنانچہ یہی ہوا اور میں نے فیصلہ
 کر لیا کہ دبے پاؤں فلم "نوكر" کی پروڈکشن سے باہر نکل
 جاؤں گا۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ شوکت چونکہ میرے اُریل مزاج
 سے واقع تھا۔ اس لیے اس نے میرے اس فرار کو سکون
 کے لیے اچھا سمجھا۔ کیونکہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں کسی
 نکتے پر آڑ جاتا تو فلم کی شوٹنگ مہینوں تک کھٹائی
 میں ہو گئی۔ اس سے شکایت تھی۔ اس کو بھی اپنی جگہ یقیناً
 ہو گی۔ مگر ہمارے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اس
 سے پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ ملک میں سیاسی گڑبرڑ کے باعث
 فلم اندرسری کی حالت بالکل چھپوئی مدنی کی سی تھی۔ کسی نے
 اسکوں پہ چڑھ کر "القلاب زندہ بادہ" کا لغڑا لگایا تو کسی
 فلموں کا استفاظ ہو جاتا تھا۔ یوں یعنی ان دونوں جنگ کے
 باعث خاص مال قریب قریب نایاب تھا۔ حالات چونکہ غیر یقینی

تھے۔ اس بیٹے بہت کم فلم ڈائرنر کٹنے والی حالت اجھی تھی۔ پہنچ دل پوسروں کے پاس ایک گھڑا گھڑایا اور بہت محفوظ بہانہ موجود تھا کہ روپیہ کہاں سے لائیں۔ جنک شروع ہے۔ آج کریٹ کی لڑائی ہے اور کل فن لینڈ کی۔ پرسوں جاپان کے محلے کا خطہ ہے۔ مگر پسح پر چھیئے تو جس وہ زمانہ تھا کہ جب پروڈیوسر اور سرمایہ لگانے والے دنے چھوٹیاں بھر بھر کے کمایا۔

شوکت کا اس درلان میں ایک اور جگہ کنٹریکٹ ہوا۔ نامابا سیٹھ نویں بیسی بھوپہری کی گھڑی ہوئی شکل کے سے۔ یہ ایک بڑا بڑا خود غلط فسروں کا انسان تھا۔ بڑے اولے درجے سے تعلق رکھتا تھا، مگر جنگ نے اسے سیٹھ بنا دیا تھا۔ اب وہ کھل کھیلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فلم کمپنی کھڑی کر دی تھی۔ دو چارہ موڑیں لے لی تھیں۔ اونچی جگہوں پر تو اس کا ہاتھ نہ پہنچتا تھا مگر وہ ایکٹرا لڑکیوں کو چھانے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔

اس سیٹھ سے شوکت کا کنٹریکٹ ہوا۔ تو اس نے یہیں ہزار روپے پیشگی دیئے۔ میں شوکت کے ساتھ تھا۔ جب چیک کیش ہو گیا تو میں نے روپے اس سے لے لیے اور اس سے کہا۔ « چلو! ڈاک نہ لے چلیں۔ »

ڈاک خانے پہنچ کر میں نے وہ روپے سب کے سب ہی شوکت کے گھر بھٹری اور بیمه کرائے۔ میرا جیاں بے

نور جہاں کو میری یہ حرکت یتینا ناگوار گز رہی ہوگی۔ لیکن میرا اس سے کیا سروکار؟۔

اسی دوران میں شوکت کو میں نے مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی کا بیمه کرائے۔ وہ میری باتوں کو بہت کم رد کرتا تھا، فوراً مان گیا۔ چنانچہ دس ہزار روپے کی پالیسی لے لی گئی۔ معلوم نہیں، مجھے یہ سب باتیں اور یہ تمام حرکات بزرگانہ ہونے کے بجائے طفلا نہ معلوم ہوتی ہیں۔ صاف اور وہ کو اُرضیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ تھا۔

نور جہاں اب خوب نکھر گئی تھی۔ صرد کی قربت بھی عورت کے حُسن کے لیے کتنی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے جسم کے خطوط اب واضح شکل اختیار کر چکے تھے۔ وہ تمام خالی چکیں جو لاہور میں پُر نہ ہوئی تھیں، بیال نکلبی میں پُر ہو گئی تھیں۔ اور اس پر جسم کی لذتوں کے قریب قریب تمام اسرار مشکشف ہو چکے تھے۔ نور جہاں گو اب بھی لوگوں کی زبان پر بے بی نور جہاں تھی۔ مگر وہ عشق و محبت کا جھولا جھول جھول کر ان تمام جھونٹوں سے آگاہ ہو چکی تھی جو اس کی رستیوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔

ایک دن آڈٹ ٹاؤن شومنگ تھی۔ بمبئی کے مصنفات میں کسی کا ایک خوبصورت باش تھا۔ جس کو شوکت نے منتخب کیا تھا۔ کیہرے کے لیےں کے ساتھ ریڈ فلٹ لگا کر منظر کشی کرنا تھی کہ دن کی بجائے رات معلوم ہوا اور جو دھوپ ہو

وہ چاند نی نظر آئے۔

شوکت نے اصرار کیا کہ میں اس کے ساتھ ضرور جاؤں۔
خشے پر ہو گئی۔ اس لیے میں سپیٹھ ویاس کی گاڑی میں وہاں
پہنچا۔ نور جہاں کو میں نے توکیش پر دیکھا تو میر می آنکھوں
کو زبردست دھکا لگا۔ عجیب و غریب لباس پہنے تھی۔ لباس کی
وشنع قطع میرے لیے نئی نہیں تھی۔ محمودی شلوار قمیص تھی۔ مگر اس
میں آنکھوں کے لیے بڑی خارش پیدا کرنے والی حدود تھی۔

شلوار جالی کی تھی۔ جسے انگریزی میں "نٹ" کہتے ہیں۔
عام طور پر یہ کپڑا کھڑکیوں کے پردہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
معلوم نہیں یہ نور جہاں کی اپنی تھی یا سید شوکت حسین رضوی کی۔
مگر وہ یہ لاکھوں کھڑکیوں والی شلوار پہنے تھی۔ جس میں اس
کی ٹانگیں بغیر کسی تکلیف کے چھپن چھپن کے باہر آ رہی تھیں۔
تمیں عبی اسی کپڑے کی تھی۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا
یہی کہ اس ملبوس نے نور جہاں کو بحال نہ کی کتنی کوشش کی ہوگی!۔

شوکبنا سمرتھ بھی موجود تھی۔ نور جہاں کو اس لباس میں
ڈکھ کر والڈ میں تو بوکھلا گیا تھا۔ ایسا لباس، پھر دشمن کے
پیش منظر میں۔ میں نے اپنی زخمی زگاہیں ادصر سے
ہٹا میں اور شوکبنا کے پاس پلا گیا۔ کہ وہ مستور تھی۔

شوکبنا سمرتھ تعییم یافتہ عورت ہے۔ گفتگو کا سلیقہ
رکھتی ہے۔ پچونکہ اچھے مریٹی خاندان کی ہے۔ اس لیے

اس میں ہاکٹ پن (مکبی کی زبان میں) نہیں۔ بڑھی ہی
با تمیز عورت ہے۔ وہ بھی اس فلم میں کام کر رہی تھی۔
میں اس کے سانچہ گھاس کے ایک آنکھے پر ٹیکھ گیا اور
اپنی وہ کوفت اور اپنا وہ تکدر دور کرتا رہا جو نور جہاں
کا ٹھہر کیوں والا لباس دیکھ کر میرے دل و دماغ میں پایا
ہوا تھا۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ مجھے
فلم "نوکر" سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ شوکت اپنی
من آمانی کر رہا تھا۔ اور میں اس میں دخل دینے سے
کرتاتا تھا کہ میرے اور اس کے تعلقات کہیں خراب
نہ ہو جائیں۔

نور جہاں سے اس کے گھر میں کئی مرتبہ ملاقاتیں
ہوئیں۔ میں نے اس کا حب بھی اور زیادہ غور سے
مطالعہ کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جس طبقے سے تعلق
رکھتی ہے، اسی کی خصوصیات اس میں بدرجہ انتہ موجود ہیں۔
اس کی ہر ادا میں اور ہر حرکت میں ایک بناؤں ادا تھی، ایک
خشنہ تھا جسے سنجیدہ نگاہیں شاید سبی قبول کر سکیں۔

مجھے تعجب ہے، کہ ٹیکھ شوکت ٹیکھ ہندوستانی
(لیکنی یو۔ پی۔ کا باشندہ) اور وہ ٹیکھ پنجابی، — ایک لحاظ سے
جتنی ہے گاؤں کی میماری — لیکن دونوں بہت خوش تھے۔
شوکت پنجابی نما اردو بولنے کی کوشش کرتا اور وہ اردو نما

پنجابی۔ خاصی دلچسپ چیز تھی۔

فلم "نوكر" ختم ہوئی تو شوکت اور میرے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ وہ عشق کے سچے سچے ہجول کر اب کار و باری دھنڈ میں مشغول ہو گیا تھا، اور میں اپنے کاموں میں گاہے کا ہے کسی فلم کمپنی کے دفتر میں، یا سٹرک پر اس سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مگر وہ بھی چند منٹوں کی خیر خیر بست دریافت کی اور اپنی اپنی راہ لی۔

فلم انڈسٹری کی حالت اب بہتر تھی۔ جنگ کا خوف پر وہ یونیورسٹی کے سر سے اتر چکا تھا۔ اور فلم انڈسٹری کے تمام متعاقبین کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ زمانہ کرانے کا ہے۔ چنانچہ لاکھوں روپے ادھر سے ادھر آ جا رہے تھے۔

شوکت ذہین ہونے کے علاوہ کار و باری آدمی بھی ہے۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور کچھ عرصے کے بعد اپنی ذاتی فلم کمپنی قائم کی۔ اور ایک ہی کامیاب فلم بنایا۔ یوں تو اس کی سماں پلے ہی قائم تھی کہ فلم انڈسٹری کے لوگ اُسے ایک قابل ڈائٹرکٹر اور ماہر اڈیٹر مانتے تھے لیکن جب اس نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھڑی کی تو انڈسٹری کے حلقوں میں اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا۔

عام طور پر ڈائٹرکٹر یا پر وہ یونیورسٹی دنیا میں کسی اکیڈمی

سے صرف اس لیے شادی کرتے ہیں کہ وہ ان کی کشتوں
حیات میں پتوار کا کام دے۔ معلوم نہیں شوکت
نے نور جہاں سے کیا اسی مقصد کے پیش نظر شادی
کی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ اس سے شادی نہ
بھی کرتا تو بھی اس کی آمدی میں روزافزوں ترقی ہوتی
رہتی۔ اس لیے کہ وہ اپنے فن کو جانتا ہے اور بچہ
مزدوروں کی طرح مشقّت کر سکتا ہے۔

محبے معلوم نہیں، شوکت بمبینی کو چھپڑا کر پاکستان کیوں
آیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بڑا کٹڑ قسر کا مسلمان ہے۔
اگر وہاں بمبینی میں کسی نے مسلمانوں کے خلاف ایک
جلدہ بھی کہ دیا ہوتا تو محبے لیتیں ہے کہ وہ اس کی
کھوپڑی چیخ کش سے نکول دیتا اور اس کی اصلاح
کرنے کی تاکام کو شکش کرتا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
نور جہاں نے اسے مجبور کیا ہو کہ اسے لاہور بہت پیارا
ہے۔ کیونکہ پنجابیوں کے کہنے کے مقابلے "لاہور لاہور ہے"۔
مبینی میں وہ بہت کامیاب تھا۔ اس نے ایک
دوفلم ایسے بنائے تھے جن سے اس کی دھاک تبلیغ
گئی تھی، وہ کروڑوں روپے وہاں پیدا کر سکتا تھا۔

لیکن اس نے پاکستان کو اپنا گھر بنایا۔ اس کا گھر پڑی
ساز دماغ جو سوئی کی ایک خفیف سی غلط حرکت کو بھی

بڑا شت نہیں کر سکتا۔ یہاں پاکستان کی فلم انڈسٹری کے یہے بھر حالتِ نزع میں تھی، کام آیا۔ اس نے شوری کا جلا ہوا، سڑا ہوا، نہایت شکر، اسٹوڈیو حاصل کیا اور اسے ایک اعلیٰ ترین نگارخانے میں تبدیل کر دیا۔

آپ میں سے بہت کم حضرات جانتے ہوں گے کہ شاہ نور اسٹوڈیو میں بھر بھی کیل ٹھکی ہے، اس میں شوکت حسین رضوی کا باختلاف ہے۔ بھر پیچ لگا ہے، اس پر شوکت کے پیچ کش کا نشان ہے۔ وہاں جھپٹے سے بُٹے سے لے کر لیبارٹری کی بجارتی بھر کم میشنری تک سب اس کے باقی کی لگی ہے۔

یہ بہت بڑا وصف ہے۔ اتنا بڑا کہ اس کے ادر دوسریں کے یہے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ سربات میں عملی طور پر دخل دینے سے اس نے کمی گڑ بڑھ کھوئے (کمی کی زبان میں) کیے ہیں۔ یوں وہ بڑے ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لیکن میں آپ کو ایک پُر اعلف قصہ سناتا ہوں۔

یہاں لاہور میں آکر بھی وہ میرا دوست ہے۔ اکثر میری مدد کرتا رہا ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گیا۔ اس کی بے داغ سفید قمیعیں کے بیٹن موجود نہیں تھے۔

میں نے اپنی چیرت کا اظہار کیا۔ کہ یہ کیا قصۂ ہے؟
اس نے مسکرا کر کہا، دیکھا تباوں یاہ — پہیے بھی
نمیں کہ بیٹھن خرید سکوں۔“

جب میں نے اس سے سگریٹ کی طلب کیا تو اس
نے مجھے بتایا کہ دس روز سے وہ سگریٹ ادھار لے
رہا ہے۔

یہ اس شخص کی حالت تھی جس کے استبُدِ یور میں
لوگوں کو رلفیر بھیڑ سے ٹھنڈا پانی ملتا ہے۔ جہاں پر ٹھوپول
کھلتتے ہیں۔ جہاں کئی مالی کام کرتے ہیں۔ جہاں سینکڑوں
مزدور ہیں۔ جہاں نور جہاں ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے
پہنچتی ہے۔ اور موڑوں میں گھومتی ہے۔

نور جہاں کے متعلق کئی افواہیں مشہور ہیں۔ بہت
ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ حقیقت پر مبنی بھی ہوں۔
لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ دو نہایت پیارے بچوں
کی میں ہے جو چیفس کالج کے صاف ستھرے ماحول
میں تعليم حاصل کر رہے ہیں اور وہ ان سے پیار کرتی ہے۔

کچھے دنوں چیفس کالج میں ایک جلسہ تھا۔ جس میں
چند نشانے منے بچوں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں ایک ٹوانس
تھا۔ رادھا کرشناؤ انس۔ نور جہاں کا بڑا بڑا کا ایک گوپی بنا ہوا
تھا۔ اس نسوانی لباس میں وہ بہت پیارا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا رقص بھی بہت خوب تھا۔

نور جہاں یقیناً رقص جانتی ہے۔ معلوم نہیں اس نے اپنے اکبر کو خود تعلیم دی ہے یا وہ خود بخود خون کے ذریعے سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ بھر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ اکبر اور اصغر جو کہ چھیس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، آگے چل کر کیا بنتے ہیں؟

کیا یہ بیری موروں اور بد فتوی راجوں کا خاندان بنے گا؟
فی الحال ہم اس کے متعلق کیا کچھ کہہ سکتے ہیں؟

نور جہاں ذرا بد دماغ ہے۔ اس کو اپنے حصہ پر تو ناز نہیں ہونا چاہیے کہ ایسی کوئی چیز اس میں نہیں ہے۔ ایک فقط آواز ہے، گلا ہے، جو نور سے لہرا ہے۔ اس پر اگر اسے ناز ہے تو بجا ہے۔ مگر بد دماغ ہونے کا پھر بھی کوئی صحیح جوانہ نہیں۔

مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ میری بیوی نے بیٹی میں مجھ سے کہا۔ "آپ نور جہاں کو جانتے ہیں۔ وہ ہمارے گھر کئی مرتبہ آچکی ہے۔ کیا وہ اب نہیں آسکتی۔ میری چند سویلیاں اس سے ملنا چاہتی ہیں۔"

میں نے اس سے کہا۔ "کیوں نہیں آسکتی۔ ہزار مرتبہ آسکتی ہے۔"

میں نے شوکت سے کہا تو اس نے دوسرے ہی روز

اسے بیچج دیا۔ میں نے بہت سی ایکر سیں دیکھی ہیں۔
 بڑے اوپنے پائے کی ہبہت مشہور، بہت معروف، مگر
 ان میں مجھے وہ تکلف نظر نہ آیا جو نور جہاں میں ہے۔
 وہ بنتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، اس کا
 سلام، اس کی مزاج پُرسی۔ سب مصنوعی ہوتی ہے۔
 معلوم نہیں یہ چیز اس کی طبیعت میں کیسے داخل ہوتی۔
 بعض اوقات جب میں اس کی اور مشوکت کی ازدواجی
 زندگی کا تصور کرتا ہوں تو مجھے یہ بھی مصنوعی سی دکھاتی
 رہتی ہے۔ لیکن اخدا کاشکر ہے کہ اسی نہیں! —
 نور جہاں آئی، سب سے بڑے پُر خلوص، تپاک
 سے، جسے میں اب بھی مصنوعی سمجھتا ہوں، ملی۔ میں تو
 چاہتا تھا کہ عورتوں کو چھوڑ کر چلا جاؤں کہ وہ آزادانہ
 طور پر گفتگو کر سکیں گی۔ مگر میری بیوی کی ایک سہیلی
 نے اصرار کیا کہ میں موجود رہوں اور نور جہاں سے کہوں
 کہ وہ گانا ناٹگا شے۔

چنانچہ میں نے فوراً بڑے بے تکلف انداز میں نور جہاں
 سے کہا کہ بھی ایک دو گانے ہو جائیں کہ یہ بگ مہتابی آواز
 کا "زندہ ناح و گانا، سنتا اور دیکھنا پا سہتی ہیں۔

نور جہاں نے ایک پُر تکلف ادا سے جواب دیا۔ نہیں
 منظہ صاحب! پیپر کھجھی — میرا گلا ٹھیک نہیں۔

میں کباب ہو گیا۔ اس کا گلا بالکل بھیک تھا۔ اس کا
گلا فولاد کا گلا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتا۔ صریحاً
خڑے کر رہ ہی تھی۔ میں نے اس سے پھر کہا۔ ”نور جہاں!
یہ بہانہ نہیں چلے گا۔“ تمہیں گانا پڑے گا۔ میں تو تمہیں
نہار مرتبہ سن چکا ہوں۔ مگر ان لوگوں کو اشتیاق ہے،
اس لیے تمہیں اچھے برسے گئے کے ساتھ ہی گا دنیا
چاہیئے۔“

بہت دیر تک اُدھر سے الکارہ، اُدھر سے اصرار ہوتا
رہا۔ میری بیوی نے کہا، جانے دو، جب وہ نہیں گانا
چاہتیں تو آپ اس قدر زور کیوں دیتے ہیں۔ مگر...
میں بھی ایک صدمی ہوں، نور جہاں کے پیچے پڑ گیا۔
آخر اس کو فیض کی وہ غزل گانی پڑتی۔

آج کی رات ساندھ پر دردندھ پھر
کرم بخت نے کیا دفعن بنائی تھی اور کیا آواز تھی کہ اب
انتہے برس گزر جانے کے بعد۔ بھی میرے کان اس
شہر بھری آواز کو سن سکتے ہیں۔

نور جہاں کے کئی عاشق ہوں گے۔ میں ایسے کئی
باور چیزوں کو جانتا ہوں جو پھر طے کے پاس نور جہاں
کی تصویریں لگا کر اپنے صاحبوں اور میموں وغیرہ کا کھانا
پکاتے ہیں اور اس کے گائے ہوئے گیت اپنی مرنی

آوانہ دل میں گھکاتے ہیں۔
اور میرے گھر میں اس کا ایک عاشق زار موجود ہے۔
وہ ہر خوبصورت لڑکی، ہر دلہن، ہر سرچبوش عورت کو
نور جہاں کہتا ہے۔ اس کو نور جہاں کے گائے ہوئے
گانے قریب قریب سب یاد ہیں۔ وہ خود بھی بلایا حسین
ہے لیکن جانے اسے نور جہاں کی کون سی ادا بھاگتی
ہے کہ وہ دن رات اسی کا ذکر کرتا ہے۔

وہ میرا قریب ترین عزیز نہ ہے۔ میری سالی اور میرے
مجاہنے کا لڑکا ہے۔ اس کا نام شاہد جلال ہے۔ ہم سب
اسے پیار سے ٹاکو کہتے ہیں۔ اس کو ہم سب بہت سمجھا
بجھا چکے ہیں کہ دیکھو تم نور جہاں کا خیال چھپوڑ دو۔ وہ
ایک بیاہتا عورت ہے۔ جس کے کئی بچے ہیں۔ تھماری
اور اس کی شادی نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ نہیں مانتا۔

فلک دیکھتا ہے لیکن اگر اس میں نور جہاں نہ ہو تو اُسے
بہت کوفت ہوتی ہے۔ یہ کوفت وہ گھر آ کر نور جہاں کے
گائے ہوئے گانے گا کر دُور کرتا ہے۔ اور اپنی ماں اور
اپنے باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اور کوئی نہیں چاہیئے،
صرف نور جہاں چاہیئے۔

پہلے دنوں اس کے دادا میاں جلال دین، شوکت
رفنوی کے پاس گئے تھے اور انھوں نے اس سے کہا تھا
کہ دیکھو! تھماری بیوی کا ایک عاشق پیا ہو گیا ہے جو

بڑی طرح اس پر مٹو ہے۔ الیانہ ہو کہ وہ کسی روز نور جہا
کو لے اڑے اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔“

وہ بہت حیران ہوا۔ اس لیے کہ میاں صاحب موصوف
نے یہ بات شوکت کو بتائی تھی۔ پہلے تو وہ جھینپا، فستے
پھر اس نے پڑھا۔ ”میاں صاحب! وہ کون شخص ہے؟“
میاں صاحب نے مسکرا کر اس سے کہا۔ ”میرا بوتا۔“

”آپ کا پوتا؟ — کیا عمر ہے اس کی؟“

میاں صاحب نے جواب دیا۔ ”یہی! چارہ برس کے
قریب۔“

یہ حال ہی کی بات ہے۔ نور جہاں نے جب یہ ساری
بات سنی تو بہت محظوظ ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”میں خود اپنے
عشق کے پاس جاؤں گی اور اس سے شادی کر لوں گی۔
شاہد جلال بہت خوش ہے کہ وہ اس دن کا بڑی
بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ جب نور جہاں خود اس
کے پاس چل کر آئے گی۔ اور وہ اس سے اپنی دلمن بنی
لے گا۔“

پچھلے دنوں نور جہاں کے ایک اور عاشق کا قصہ
سننے میں آیا تھا۔ مگر وہ چارہ برس کا نہیں تھا۔ اجھا خامسا
جران تھا اور غالباً نائی یعنی حجام تھا۔ ہر وقت اس کے
گائے ہوئے گانے نے گاتا رہتا تھا اور اسی کی باتیں کرتا
تھا۔ ایک آدمی نے اس سے کہا۔ ”کیا واقعی تھیں

نور جہاں سے محبت ہے ہے؟ ”
حجام نے بڑے پُر خلوص انداز میں اسے جواب دیا:
” اس میں کیا شک ہے۔ ”

اس کے دوست نے اس کا امتحان لینا چاہیا۔ ” اگر
تمہیں اس سے سچی محبت ہے تو کیا مہینوں کی طرح
تم اس کے لیے اپنا گوشت دے سکتے ہو؟ کہ کباب بنا
کر اسے بچھے جائیں؟ ”
حجام نے تیر استرانکال کر اپنے ہاتھ میں دے دیا
اور اپنے دوست سے کہا۔ ” جہاں سے چاہو، تم میرا
گوشت کاٹ لو۔ ”

اس کا دوست بھی معلوم نہیں، کس قسم کا انسان تھا۔
کہ اس نے اس کے بازو سے پاؤ ہب گوشت کا ٹکڑا
ہسترے سے کاٹ کر الگ کر دیا اور خود بھاگ گیا،
کہ حجام صاحب اس فربانی کے بعد خون کے بھاؤ کے
باعث بے ہوش ہو گئے۔

اس سے عاشق زار کو جب میو ہسپیال میں داخل کیا گیا اور
جب اس کو تقوڑا ساموش آیا تو اس کی زبان پر نور جہاں
کا نام نظر۔

نور جہاں کا خاوند بانکا چھبیلا سید شوکت حسین
رضوی موجود ہے۔ اس کی خوبصورت اولاد ہے۔ وہ

مال ہے۔ اس کے لیے لاہور کا جامِ اپنی ران کا
نہیں تو اپنے بازو کا پاؤ بھر گوشت میسے سکت
ہے۔ اس کا چار برس کا مخصوص عاشق شاہد جلال
عرف نما کو ہے جو ہر وقت اس کو دلمن بنانے کے
خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وہ باورچی ہیں جو اس کی
تصویر چوٹھے کے پاس رکھ کر کھانا پکاتے ہیں۔ جو
بہترین مانجھتے وقت اس کے گائے ہوئے گانے اپنی
کنسری آواز میں گماتے ہیں۔ اور یوں اپنی مشقت
کا بوحجد ہلکا کرتے ہیں۔ اور ایک میں ہوں کہ جو اس
کی وامیات انگیا دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں —
معلوم نہیں، وہ اتنی آٹھان میں کیا خوبصورتی دیکھتی
ہے۔ اور سید شوکت حسین رضوی اس زیادتی کی
اجازت کیوں دیتا ہے، جو باذوق نگاہوں پر بہت
گران گزرتی ہے ۔

سَعَادُونْ حَسَنْ مُشْتُو

مشونہ تو کسی کوشرم دلاما ہے نہ کسی کول اور استپر
لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طرزیہ مشکراہٹ کے سانہ اناؤں
سے یہ رکھتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور
مہیں جاسکتے اس اعتبار سے مشوکو انسانی فضرت پر کہیں
زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عکری

مشو نے زندگی کے زہرا ب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔
چھوٹا ہے، چکلہے اور اب وہ ایک نشتر بن کر سماج کے فائدے
مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ میریغز چینتتا بے چلو قاتا ہے،
بین کرتا ہے، مشو کو اس کی پرواء نہیں وہ اس قدر بیجم
ہے کہ کلورو فارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

مشو ادم کی جڑاٹ گاہ کا فامل ہے۔ مشو کا انسان نوری
ہے سر ناری، وہ ادم خاکی ہے۔ — وہ وجود خاکی جس میں
بنیادی گاہ، فاد، قتل و خون وغیرہ کے باوجود خدا نے نوری
فرشتوں کو حکومد یا نقا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

متاز شیریں

مکتبہ شد نہا، ۱۶، ۸۰۰، ۱۶۰۰